دردکاصحرا

(افسانوی مجموعہ)

مصنفہ
خلیق النساء

والد محترم جناب خلیل اللہ خاں

دردکا صحرا

(افسانوی مجموعہ)

مصنفہ

خلیق النساء

کتاب کا نام : دردکا صحرا (افسانوی مجموعہ)

مصنفہ : خلیق النساء

مزار ٹاٹ شاہ میاں رام پور (یو پی) 244901

موبائیل نمبر: 09359684965

ناشر : خلیق النساء

سال اشاعت : ۲۰۱۱ء

صفحات : ۲۰۰

تعداد : ۴۰۰

قیمت : ۲۵۰ روپے

کمپیوٹر کمپوزنگ : فائزہ تنویر

کوچہ لالہ میاں رامپور (یو پی)

موبائیل نمبر: 09258431877

طابع : تنظیم رضا قریشی

اسلامک ونڈرس بیورو

2660، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

011 23263996 موبائیل: 09350334143

کتاب ملنے کے پتے : ☆ مکتبہ دین وادب، امین آباد، لکھنؤ

☆ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

☆ زریں شعاعیں پبلی کیشنز، جے پی نگر، بنگلور

☆ نیرنگ بک اسٹال، پان دریبہ، رامپور

انتساب

والد محترم جناب خلیل اللہ خاں مرحوم و مغفور کے نام جن کی تعلیم و تربیت نے میرے ذہن کو جلا بخشی۔ جو میری تحریر کا سر چشمہ تھے۔ آج ان کے ہدایات اور مشورے راہ ادب ہی نہیں زندگی کے ہر موڑ پر شمع ہدایت کا کام دے رہے ہیں۔ ان کی وفات کو تیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر مجھے لگتا ہے کہ وہ آج بھی میرے ساتھ ہیں۔

خلیق النساء

یہ کتاب اتر پردیش اردو اکادمی کے
جزوی، مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے

اس کے مندرجات سے اتر پردیش
اردو اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں

فہرست

افسانے

پیش لفظ

رام پور، بزبان غالب دارالسرور، تقریباً دو صدیوں سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ شاعری میں حمد ونعت، غزل، قصیدہ، قطعہ، رباعی، سلام، مسدس ومخمس، نظم، مثنوی وغیرہ اور نثر میں داستان، ناول، افسانہ، تاریخ، انشائیہ، خاکہ، طنز ومزاح، تنقید، تحقیق، سفرنامہ، اسلامی علوم اورادب اطفال جیسی اہم اصناف میں یہاں کے قلم کاروں نے ملکی اور عالمی شہرت پائی۔ اگرچہ داستان کے حوالے سے رام پور کو کم ہی لوگ جانتے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ رام پور رضا لائبریری میں، رام پور کے ہی داستان نگاروں کی تقریباً ڈیڑھ سو قلمی داستانیں موجود ہیں۔ لیکن جن لوگوں کی یہ ذمہ داری تھی کہ داستان کے میدان میں بھی رام پور کی ایک شناخت بناتے، انہوں نے اس سلسلے میں کوئی خاص کیا، کوئی سرسری کام بھی نہیں کیا اور جنہوں نے بہت تھوڑا کام کیا بھی، انہوں نے اپنی انا کے خول سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی، نہ خود اپنی تحقیق سے فائدہ اٹھایا اور نہ دوسروں کو مستفید کیا۔

زیرنظر کتاب کے پیش لفظ کی ابتداء میں داستان کے حوالے سے گفتگو کا آغاز میں نے اس لیے کیا کہ ناول اور افسانہ کا پیش رو اور جد امجد داستان کو ہی مانا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ داستان کی ہی طرح رام پور میں ناول اور افسانہ کو بھی کافی فروغ ہوا اور یہاں کے فنکاروں نے اپنے قلم کی خوب جولانیاں دکھائیں اور صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ سرحد پار بھی شہرت وناموری پائی۔ ان فنکاروں میں مردوں کی طرح خواتین ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کے نام بھی شامل ہیں۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کے کارناموں کو بھی اس طرح اجاگر نہیں کیا گیا جس کی وہ پہلے بھی حق دار تھیں اور آج بھی اس کی مستحق ہیں اور اس حق تلفی کے ذمہ دار رام پور کے ادارے بھی ہیں اور چند ''مخلص'' افراد بھی اور کسی حد تک وہ خود افسانہ نگار بھی!

خلیق النساء رام پور کی ایک بزرگ اور معروف ناول وافسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے اب تک آٹھ ناول اور ایک سو سے زیادہ افسانے لکھے ہیں۔ مضامین، تبصرے، خاکے، انشائیے

وغیرہ اس کے علاوہ ہیں۔ ان کی بیشتر تخلیقات ملک میں خواتین کے لیے شائع ہونے والے رسائل میں چھپ چکی ہیں۔

عورت کا دکھ، ان کے بیشتر افسانوں کا مشترکہ موضوع ہے۔ اس کے علاوہ سماجی نابرابری، خاندانی استحصال، غربت، افلاس، یتیمی کا کرب، بے گھری کا درد، جہیز کی عدم فراہمی، لڑکے یعنی دولہا والوں کے غیر ضروری مطالبات، بیوگی کا المیہ، تعلیم کا فقدان، تربیت میں کمی کے اثرات، خون کے رشتوں کی سرد مہری، اولاد کا سکھ، لاولد رہنے کا غم، سوتیلی ماں کی ظلم وزیادتی، دوسری شادی کی ضرورت، سوتن کے جوروستم، بھائی بھاوج کی لاتعلقی، انا پرستی، خودغرضی، غرور وتکبر کے باعث اجڑتے گھر، بے وجہ کی ضد کا بھیانک انجام، سرمایہ دارانہ بیہودہ نظام، غم والم، رنج ومحن، شادی بیاہ، رسم ورواج وغیرہ موضوعات کی رنگا رنگی ان کے افسانوں میں جابجا نظر آتی ہے۔

ان کے افسانوں کی زبان شائستہ، مہذب اور کہیں کہیں بامحاورہ ہے۔ گھریلو ماحول چاہیں اعلیٰ گھرانوں کا ہو یا درمیانی طبقہ کا، ان کے ہر افسانہ کا حصہ ہے۔ افسانوں کے کلائمکس متوقع اور غیر متوقع، دونوں طرح کے ہیں۔ ان کے سارے ہی افسانوں کو پڑھ کر مجموعی تاثر یہ ابھرتا ہے کہ عورت مظلوم ہے اور سماج کا ہر طبقہ اور خاندان کا ہر فرد اس کا استحصال کرتا ہے۔ ان کی کہانیوں کے تناظر میں، پروین شاکر کے الفاظ میں، اپنوں سے شکایت کو بیان کریں تو یہ مفہوم واضح ہوتا ہے:

ردا چھینی مرے سر سے مگر میں کیا کہتی
کٹا ہوا تو نہ تھا ہاتھ میرے بھائی کا

ان کی کہانیوں کے کرداروں والی لڑکی صرف اس بات پر شکوہ کناں اور اس امر پر مصر ہے کہ مرد نے اس پر ظلم وزیادتی کی ہے اور مرد ہی اس کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ کاش یہ نظر یہ بدلے، حالات بدلیں اور دونوں باتیں سامنے آئیں کہ عورت کا سب سے بڑا دشمن مرد نہیں بلکہ خود عورت ہے اور یہ کہ مرد عورت ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں اور زندگی کی گاڑی دو پہیوں کے توازن سے ہی چلتی اور چل سکتی ہے:

وہ اب میری ضرورت بن گیا ہے
کہاں ممکن رہا اس سے نہ بولوں

خلیق النساء کی کہانیوں کے پلاٹ نہایت مربوط ہیں۔واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے سے منسلک اور کہیں کہیں ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ان کے کردار ہمارے معاشرے کے ہی لوگ ہیں جو ایک دوجے کے شریک غم بھی ہیں،شریک درد بھی اور موقع ملنے پر محبت کی ڈور کو کاٹ ڈالنے والے بھی۔ان کے افسانوں کی فضا صاف ستھری،پاکیزہ اور طاہر و مطہر ہے۔نائٹ کلبوں،پارکوں،بازاروں،فلم ہالوں،ام الخبائث،سگریٹ نوشی،لڑکوں کی کج روی،لڑکیوں کی بے راہ روی وغیرہ کے اظہار سے انہوں نے اپنے افسانوں کو پاک رکھا ہے۔اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بیشتر خواتین کے رسائل کے لیے لکھا ہے۔یہ اچھی بات ہے،بہت اچھی بات! لیکن دوسرے ادبی رسائل کا رخ نہ کرنے یا ان کی طرف بہت کم ملتفت ہونے سے،میرے نزدیک ان کو ادبی نقصان ضرور ہوا ہے۔اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ان خواتین افسانہ نگاروں کی روش پر چلیں،جنہوں نے ادب کے نام پر فاش اور فحش لکھنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔لیکن میں یہ ضرور مانتا ہوں کہ چند مخصوص رسائل تک اپنے آپ کو محدود رکھنے سے وہ ان موضوعات پر قلم نہ اٹھا سکیں جو آج وقت اور سماج،دونوں کی ضرورت ہیں۔ان کے تقریباً سبھی افسانوں کی بنیادی اور مرکزی کردار عورت ہے۔لیکن میرا خیال ہے کہ اردو افسانہ کا کینوس نثری اصناف ادب میں سب سے زیادہ وسیع اور کشادہ ہے۔اس لیے افسانے کے موضوعات عورت ذات سے ہٹ کر بھی بہت کچھ ہیں۔علامہ اقبال نے تاسف کے ساتھ شاید اسی لیے اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا:

ہند کے شاعر و،صورت گر و،افسانہ نویس
ہائے بیچارے کے اعصاب پر عورت ہے سوار

ایک قاری کی حیثیت سے میں یہ ذمہ داری سمجھتا ہوں کہ ان کے افسانوں کے محاسن کے تذکرے کے ساتھ،اس ایک منفرد عیب کا بھی ذکر کروں،جو کم سے کم مجھے ان کے افسانوں میں قطعی پسند نہیں آیا اور میرے نزدیک وہ عیب ہے افسانوں میں انگریزی الفاظ اور جملوں کی بھرمار،واضح ہو یہاں اردو اور انگریزی کی

مقبولیت یا نا مقبولیت کا جائزہ پیش کرنا مقصود نہیں ہے۔ لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ آج دنیا کی تیسری بڑی زبان کا نام ہے اردو، اور یہ لسانی جائزے ہمارے نہیں بلکہ اقوام متحدہ جیسے ذمہ دار ادارہ کے پیش کردہ ہیں۔ اردو کے اندر عربی کے علاوہ، دنیا کی بڑی سے بڑی زبان سے ٹکر لینے اور مقابلہ کرنے کی ہمت وصلاحیت موجود ہے۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ افسانوں میں اپنے مطلب اور مفہوم کو ادا کرنے کے لیے ہم جن انگریزی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں، ان سارے انگریزی الفاظ کے نعم البدل کے طور پر اردو میں وافر الفاظ موجود ہیں۔ صرف وہ الفاظ جو انگریزی کے ساتھ اردو زبان کا بھی حصہ بن گئے ہیں۔ ان کے استعمال میں بظاہر کوئی حرج نظر نہیں آتا جیسے اسٹیشن، مشین، فیکٹری، پین، فلم وغیرہ۔ لیکن جن الفاظ کے ذریعہ ہم اردو میں اپنی بات اچھی طرح واضح کر سکتے ہیں یا مضمون اور مفہوم کو ادا کر سکتے ہیں، ان کے لیے انگریزی کی بیساکھی کی قطعی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔

خلیق النساء صاحبہ کو لکھنے، پڑھنے کا شوق بچپن سے رہا ہے۔ اس کے لیے ان کے گھریلو ماحول اور رام پور کی ادبی فضا کو بھی بڑا دخل رہا ہے۔ شدید گھریلو مصروفیات اور بڑھتی عمر کے باوجود ان کا ادبی ذوق وشوق برقرار ہے۔ اور ان کا قلم برسر عمل اور برسر پیکار ہے۔ ان کا خلوص ان کی ہر تحریر سے عیاں ہے اور ان کے افسانوں پر جو بے لاگ رائے پیش کی گئی ہے وہ بھی ایک خلوص کے ہی زمرے میں آتی ہے ورنہ یہ تحریر پیش لفظ نہیں بلکہ تقریظ بن جاتی، اور تقریظ کا عنوان دے کر بے جا تعریف کرنا کبھی ہمارا مقصد اور مطمح نظر نہیں رہا۔

خدا کرے ان کا پہلا افسانوی مجموعہ قبول عام کی سند حاصل کرے اور ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ بھی جلد شائع ہو۔ آمین!

۲۳رفروری ۲۰۱۱ء بروز بدھ

ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں
غوث منزل، تالاب ملا ارم
رامپور 244901 (یوپی)
موبائیل:0971931670

تاثرات

محترمہ خلیق النساء صاحبہ کا منفرد انداز ہے۔ ان کے یہاں کسی کی تقلید نہیں دکھائی دیتی۔ وہ معاشرے کی گرتی ہوئی اقدار کا صرف شکوہ کر کے خاموش نہیں رہتی ہیں۔ بلکہ ان کے سامنے اعلیٰ قدروں کے نمونے پیش کر کے رہبری کرتی ہیں۔ تحریروں کی زبان پختگی کے ساتھ سلیس اور رواں ہے۔ جو انہیں اظہار فکر میں بھرپور تعاون کرتی ہے۔ واقعات کی ڈرامائی سچویشن (situation) میں کبھی کردار کی زبان سے کبھی رائٹر (writer) کے بیان میں ایسے فقرے تحریر کرتی ہیں جو لطیف پیرائے میں طنز کے ساتھ اس سچویشن کو بھرپور واضح کر کے پراثر بناتے ہیں۔

ان کا مجموعہ چھپ رہا ہے۔ انہیں مبارکباد کے ساتھ، دعا ہے کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ہو۔

سردار جاوید خاں ایڈوکیٹ
چیئرمین میونسپل بورڈ
رام پور

خلیق النساء - ایک ممتاز افسانہ نگار

اردو میں افسانوی ادب کی تخلیق میں خواتین کا حصہ مرد افسانہ نگاروں سے کسی بھی طرح کم نہیں رہا ہے۔ ہندو پاک سے شائع ہونے والے متعدد ڈائجسٹ اور رسائل اس امر کے گواہ ہیں۔آج بھی خواتین قلم کاروں کی اکثریت کی دلچسپی افسانوی ادب سے وابستہ ہے۔ جو معاشرتی، رومانی اور اخلاقی افسانے تخلیق کر رہی ہیں۔ ان خواتین افسانہ نگاروں میں رام پور کی بھی کئی افسانہ نگار ہیں جنہوں نے قابل قدر افسانے اور ناول تخلیق کیے ہیں۔ محترمہ خلیق النساء بھی ان میں سے ایک ہیں۔

خلیق النساء ایک معمر، تجربہ کار، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ادبی ذوق کی حامل خاتون ہیں۔ایک شریف اور باوقار خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ جہاں مشرقی تہذیب وروایات پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے...... شاید یہی وجہ رہی کہ وہ کئی دہائیوں سے ہندو پاک کے معروف ومعتبر رسائل وجرائد میں اپنے افسانوں کی اشاعت کے باوجود مقامی طور پر گمنام رہیں۔ مقامی ادبی انجمنوں اور تنظیموں سے الگ رہیں۔ ادبی پروگراموں میں شرکت نہ کرنے کی وجہ سے انہیں وہ شہرت اور مقام حاصل نہیں ہوسکا جس کی وہ مستحق تھیں۔ یہی نہیں ادبی حلقوں کی بھی بے اعتنائی رہی۔ لیکن وہ نہ مشرقی اقدار کی پاسداری پر مایوس اور نہ ہی دوسروں کی غفلت پر شکوہ وملال۔ وہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز، اپنے ذوق کی تسکین اور سماج کے تئیں اپنی ذمہ داری کے احساس کے پیش نظر افسانے لکھ رہی ہیں اور معیاری رسائل وجرائد میں چھپ رہی ہیں۔

خلیق النساء ایک کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ افسانوی ادب پر ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اور مشاہدہ قوی۔ وہ نہ صرف اپنے گرد وپیش پر نظر رکھتی ہیں بلکہ اپنے مطالعہ اور قوت تخلیہ کے سہارے دور دراز تک کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ معاشرتی زندگی میں پیش آنے والے بظاہر عام سے واقعات کا وہ ایسا نفسیاتی تجزیہ کرتی ہیں کہ ان کی اہمیت

بہت بڑھ جاتی ہے۔انہوں نے اپنے پلاٹ عموماً اپنے اطراف سے اور اپنے معاشرہ سے اخذ کیے ہیں۔ان کے افسانوں کا مجموعہ متوسط سماج رہا ہے۔وہ خود ایک باعزت مشرقی اقدار کے پاسدار متوسط خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس طبقہ کی عورت کی سماجی حیثیت کا گہرا شعور رکھتی ہیں۔عورت کی ذمہ داریوں کے بوجھ،اس کی مجبوری، محکومی اور استحصال پر گہری نظر اور سنجیدہ فکر رکھتی ہیں......لیکن عالی شان محلوں اور کوٹھیوں میں گھٹ گھٹ کر جینے والی اور برتری کے احساس میں مبتلا انا پرست مردوں کی ضد اور ہٹ دھرمی کی شکار عورت کے کرب،اس کی دبی دبی چیخیں،آنسو اور آہیں بھی وہ محسوس کرتی اور موثر انداز میں پیش کرتی ہیں۔انہیں مظلوم عورت کے جذبات واحساسات کو پیش کرنے کا ہنر اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں سے کہیں زیادہ اچھا آتا ہے۔وہ نہ صرف معاشرہ کی کمزوریوں پر نشتر زنی کرتی ہیں بلکہ عورت کے ایثار وقربانی،خلوص ومحبت،وفا شعاری اور خود سپردگی جیسی فطری کیفیات کو بڑی چابکدستی سے افسانے کے قالب میں سمودیتی ہیں۔ بھرم ، تقدیر کا تماشہ،بنت حوا کے تین روپ،وارث وغیرہ ہوں یا دوسرے افسانے، میں نے تقریباً سبھی کا مطالعہ کیا ہے اور ان میں سے اکثر کو ماہنامہ بتول میں شائع بھی کیا ہے......وہ اچھی افسانہ نگار ہی نہیں،کامیاب ناول نگار بھی ہیں۔ان کے ''ماہ پیکر'' اور ''انوکھے رشتے کا کرب'' جیسے معاشرتی ناول بھی قسط وار شائع ہو چکے ہیں۔

خلیق النساء ایک روایتی افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں کی ایک نمایاں خوبی پلاٹ کا چست ہونا ہے۔افسانہ پڑھنے کے بعد کہیں ادھورے پن کا احساس نہیں ہوتا،کوئی تشنگی محسوس نہیں ہوتی اور جو کچھ وہ کردار سے کہلوانا چاہتی ہیں نہایت موزوں اور نپے تلے الفاظ میں بھرپور تاثر کے ساتھ اس طرح کہلواتی ہیں کہ قاری کا ذہن مکالموں کے سحر میں کھو جاتا ہے۔وحدت تاثر بھی ان کے افسانوں کا بنیادی وصف ہے۔

خلیق النساء کے افسانوں میں رومان انتہائی محتاط انداز میں اس طرح فرحت بخشتا ہے جیسے کسی گلشن سے آنے والی بادِ صبا ماحول کو معطر کرتی اور طبیعت کو فرحت عطا کرتی ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں حسب ضرورت اشعار شامل کرنے کی روایت کو بھی

برقرار رکھا ہے...... بہر حال اپنی ہم عصروں کے مقابلے میں خلیق النساء کا تخلیقی سرمایہ کہیں زیادہ ہے۔ پیش نظر افسانوی انتخاب ''درد کا صحرا'' کو تو آغاز سمجھنا چاہیے۔ میری خواہش ہے کہ جلد ہی ان کا دوسرا مجموعہ بھی منظر عام پر آئے۔ مجھے یقین ہے کہ خلیق النساء کا یہ افسانوی مجموعہ قارئین کو بے حد پسند آئے گا۔

مرتضٰی ساحل تسلیمی
شتر خانہ کہنہ
رام پور

تاثرات

راقم السطور ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم ہے اس بناء پر کسی ادبی فن پارہ پر رائے دینے کا اسے حق نہیں پہنچتا۔ چونکہ اس ناچیز کو بچپن سے علماء ادب کی صحبتوں میں بیٹھنے کا موقع ملتا رہا اس لیے کثرت سے مطالعہ کا شوق ہے نیز مخصوص موضوعات پر رسائل، حوالجاتی کتب، تاریخ اور تذکروں کے جمع کرنے کا شوق بھی رہا ہے۔

میرے مطالعہ کے موضوعات یوں تو تاریخ، تذکرہ اور صحافت سے تعلقات رکھتے ہیں لیکن روہیل کھنڈ کے مصنفین کے تمام موضوعات پر مبنی کتابیں پڑھنے سے گہری دلچسپی ہے۔ اسی سبب سے افسانوی ادب کا مطالعہ بھی کیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''درد کا صحرا'' ہماری بزرگ وار محترمہ خلیق النساء صاحبہ کا افسانوی مجموعہ ہے۔ خلیق النساء صاحبہ گزشتہ تیس برسوں سے گوشہ نشیں رہ کر مسلسل افسانے لکھ رہی ہیں۔ ان کے افسانے رام پور کے قدیم رسائل نور، بتول اور حجاب کے علاوہ بریلی، دہلی لکھنؤ، بنگلور اور دیگر شہروں کے مشہور رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس سے ان کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔

میں نے ان کے جو افسانے پڑھے ہیں ان میں بھرم، واپسی، رشتے کی سوغات، تماشائے اہل کرم، اجالے کا قرض اور نیم کا پیڑ شامل ہیں۔ ان کا انداز بیان سہل اور اسلوب سادہ و سلیس ہے۔ بات کو کہنے کا ڈھنگ انہیں خوب آتا ہے۔ یہی چیز انہیں روہیل کھنڈ کے دیگر فنکاروں میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

میری دعا ہے کہ خلیق النساء صاحبہ کا یہ افسانوی مجموعہ دنیائے ادب میں قبولیت عامہ حاصل کر لے۔

۲۲ر فروری ۲۰۱۱ء

ڈاکٹر محمد شعائر اللہ خاں وجیہی

ایڈیٹر ماہنامہ ضیاء وجیہ۔ رام پور

درد کا صحرا: ایک نظر

میری نگاہوں کے سامنے خلیق النساء کا افسانوی مجموعہ ''درد کا صحرا'' ہے۔ جس کا ہر افسانہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ ایک صاحب احساس کے قلم سے لکھا گیا ہے۔ خلیق النساء بیگم ایک معزز خاندان کی مجبور بیٹی ہیں۔ وہ ان بدنصیب ہستیوں میں شامل ہیں جن کو غالباً دنیا میں صرف آزمائشیں جھیلنے کو بھیجا جاتا ہے۔

ایک دوست کے ناطے اس کی زندگی میرے سامنے ایک کھلی کتاب کی مانند ہے۔ شروع ہی سے ان کے ہاتھ میں قلم رہا۔ جس قدر کرب واذیت سے حالات ناگفتہ ہوتے گئے تحریر میں جلا آتی گئی۔ نئی نئی تشبیہات تحریر میں جگہ پاتی رہیں۔ اس کی تحریر میں درد بھی ہے، اندرون غصہ بھی اور زمانے سے نفرت بھی جو ناکام زندگی کی لاچارگی کہی جاسکتی ہے۔ زندگی کی بے بسی اور مایوسی ایک ایسی مظلوم عورت کی آپ بیتی ہے جس کا حال دل سننے والا کوئی نہیں۔ اصل حقیقت کہتے کہتے وہ ادھر ادھر بھٹکنے لگتی ہیں گویا بزبان حال کہتی ہیں:

قلم نہ ہوتا تو ہم کس سے اپنا غم کہتے
یہ ایک قلم ہے جو سب کے دکھوں کو سنتا ہے

دختر جہاں
(ایم۔اے، بی ایڈ علیگ)
ریٹائرڈ لکچرر خورشید گرلز انٹر کالج
نشیمن، کوتوالان رام پور

کچھ میرے قلم سے

شکر ہے پاک پروردگار کا کہ اس نے مجھے ایک علمی، ادبی، مذہبی خاندان کی رکن بنا کر اس عالم آب وگل میں بھیجا۔ میرے والد خلیل اللہ خاں مرحوم مشہور علمی وادبی شخصیت تھے۔ والدہ بھی محمود خان محمود جانشین داغ کی نواسی' صاحب علم تھیں۔ لہٰذا علم وادب دونوں جانب سے ورثہ میں ملا۔ شعور کی دنیا میں آتے ہی ہر طرف کتابیں نظر آئیں۔ بچپن سے مطالعے کی عادت ہوگئی جس میں وقت کے ساتھ ساتھ ترقی ہوتی گئی۔ تقریباً بارہ سال کی عمر سے قلم ہاتھ میں لیا۔ الٹی سیدھی کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ ان ہی میں سے ایک کہانی ''ماں'' لکھی۔ پاکستان سے ایک عزیزہ آئی ہوئی تھیں وہ اپنے ساتھ کراچی لے گئیں۔ کراچی کے مشہور رسالہ ''نقاد'' میں چھپ گئی۔ وہ خوشی آج بھی یاد ہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ وقت آگے بڑھا زندگی میں سیکڑوں اتار چڑھاؤ آئے۔ معاشرے نے نئی کروٹ لی۔ ادب کی کوئی بھی صنف ہو اس کا تعلق اپنے تجربات، جذبات واحساسات سے ضرور جڑا ہوتا ہے۔ جوں جوں عمر بڑھتی ہے تجربات وسیع اور مشاہدہ تیز ہوتا جاتا ہے۔ نامساعد حالات سوچوں کے دھارے کو اکثر مدد دیتے ہیں۔

بنت حوا کی بے بسی، بے کسی اور اس پر ہونے والے مظالم کی تصویریں صفحہ قرطاس پر اترتی رہیں۔ آج ہر طرف عورت کی آزادی اور مساوات کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ لیکن وہ آج بھی وہیں ہے جہاں اسلام سے پہلے تھی۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ پہلے زندہ دفن کی جاتی تھی، آج قسطوں میں مر رہی ہے۔ کہیں جہیز کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے۔ کہیں مرد کے جبر وظلم کا شکار اور کہیں مرد اس کی سلطنت کو دوسری عورت کے ذریعہ تقسیم کر دیتا ہے۔

برسوں سے رسائل میں لکھتی رہی چند کرم فرماؤں نے مجموعے کی اشاعت کا مشورہ دیا۔

جن میں پہلا نام ڈاکٹر اطہر مسعود خاں کا ہے جنھوں نے نہ صرف مشورہ دیا بلکہ مکمل تعاون بھی۔ ان کے تعاون کے بغیر غالباً یہ مجموعہ اشاعت کی منزل سے گزر ہی نہیں پاتا۔ میں تہہ دل سے اس نیک نفس انسان کی احسان مند اور شکر گزار ہوں۔

اس کے علاوہ محترمہ ترنم عقیل صاحبہ چیئر پرسن اردو اکادمی اور محترم مسرت خاں صاحب (چیئر مین شاہ آباد)، جناب سردار جاوید خاں صاحب (چیئر مین رام پور)، جناب شعائر اللہ خاں اور جناب مرتضیٰ ساحلؔ صاحب (مدیر اعزازی بتول ڈائجسٹ) اور اپنی عزیز دوست محترمہ دختر جہاں (سابق لیکچرار خورشید گرلز کالج) کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ جنھوں نے کسی نہ کسی زاویہ سے میری تحریر میں دلچسپی لے کر اپنی معاونت کا ثبوت دیا۔

خلیق النساء

بھرم

نفس کو آنچ پر وہ بھی عمر رکھنا
بڑا محال ہے ہستی کو معتبر رکھنا

''نیلماں کسی روز میرے گھر چلو'' کالج کانٹین میں علی نے سامنے بیٹھی نیلماں سے کہا۔ ''کیوں؟''

''کیوں کا کیا سوال ہے۔'' میں تمھیں اپنی ماما سے ملوانا چاہتا ہوں۔'' علی کے انداز میں وارفتگی تھی۔

''تمہاری ماما سے ملنے کا تو مجھے بھی بڑا ارمان ہے۔'' ''کیوں؟'' علی نے اس کا ''کیوں'' واپس کرتے ہوئے پُر مزاح انداز میں کہا۔

''کیوں کا کیا سوال۔'' نیلماں کب پیچھے رہنے والی تھی۔ دونوں بے ساختہ ہنس پڑے۔''علی تم نے اپنی ماں کی اتنی تعریفیں کی ہیں کہ میں انھیں دیکھنے کو بیقرار ہو اٹھی ہوں۔''

''جو کچھ میں نے اُن کے بارے میں کہا ہے وہ تو کچھ نہیں کاش میں ڈکشنری میں کچھ اچھے Adjective کا اضافہ کرسکتا۔''

''اُٹھو علی سر خالد کا پیریڈ مس ہو جائے گا۔'' دونوں ساتھ ساتھ چلتے کانٹین سے باہر آئے ''نیلماں پھر کب چلوگی ماما سے ملنے۔'' علی نے استفسار کیا۔''کل۔'' ''آج کیوں نہیں''۔

''آج کی شام مصروف ہے پاپا کے دوست کی بیٹی کی شادی پر جانا ہے۔''

نیلماں کالج کی سب سے حسین لڑکی جو کبھی جنسِ مخالف سے متاثر نہیں ہوئی تھی۔ کتنے منچلوں نے دوستی کے نام پر اس تک آنا چاہا لیکن اس کا لیا دیا انداز' سرد مہر رویہ، بے نیازی کے رویے کے آگے مجبور ہو گئے۔ خوبرو، بلند قامت، متانت کے پیکر علی نے عام سطحی نو جوانوں کی طرح کبھی نیلماں کی راہوں میں آنے کی کوشش نہیں کی۔ کون سا معجزہ ہوا کہ محبت جیسے الوہی

جذبے نے دونوں کو ایک ان دیکھی زنجیر میں باندھ دیا۔ دونوں کی پیشانیوں پر پاکیزہ محبت کے ستارے جگمگانے لگے............

نیلی جینز اور پنک شرٹ آنکھوں پر سن گلاسز لگائے وہ اتنا شاندار لگ رہا تھا کہ اسے اپنا آپ اس کے سامنے بہت حقیر لگنے لگا۔

''آیئے'' اس نے فرنٹ ڈور کھولا۔ وہ بیٹھی تو دوسری جانب سے گھوم کر خود بھی ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا گاڑی گیر میں ڈال کر اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ سڑک کے دونوں اطراف سرسبز درخت، فلک بوس عمارتیں، نہر کا بہتا پانی اور اسے چھو کر آنے والی نم ہوا۔ گاڑی سے باہر کے خوبصورت مناظر اپنی جگہ اندر اسکی دلفریب شخصیت کی قربت کا سحر۔ نیلماں کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ وہ بہت ترنگ میں گاڑی چلا رہا تھا۔ آج کتنا خاص دن ہے۔

اپنی محبت اپنی چاہت کو ماما سے ملوانے جا رہا ہے۔ ادھر نیلماں سوچ رہی تھی کاش یہ سفر کبھی ختم نہ ہو دونوں بظاہر خاموش تھے کبھی کبھی خاموشی بھی گفتگو بن جاتی ہے زبان خاموش ہوتی ہے جذبے بولتے ہیں...... ''لیجئے میڈم آ گئی آپکی منزل۔'' سفید پینٹ والے وسیع بنگلے کے گیٹ کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے علی نے مسکرا کر کہا۔

''منزل آ گئی'' اس کا سحر ٹوٹ گیا۔

''ہر سفر کی ایک منزل ہوتی ہے سمجھو تمہاری یہی منزل ہے''۔ علی کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''ویسے تمھیں ماما سے ملوانے کی ایک وجہ اور بھی ہے'' علی نے اترتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا؟''

ماما کو ہر ماں کی طرح میری شادی کا خیال کچھ زیادہ ہی ستانے لگا ہے وہ اِدھر اُدھر لڑکیاں دیکھ رہی ہیں''۔ نیلماں کے چہرے پر حیا کے سائے لہرانے لگے اسکی پلکیں جھک گئیں۔

''علی اگر میں تمھاری ماما کی پسند پر پوری نہ اتری۔'' نیلماں کے لہجے میں خدشہ بول رہا تھا۔ کیوں کیا کمی ہے تم میں اور سب سے بڑھ کر میری پسند ہو وہ ریجکٹ کر ہی نہیں سکتیں''۔

''اتنا اعتماد ہے..... ارے اعتماد تو بہت چھوٹا لفظ ہے ابھی تم خود دیکھ لوگی۔'' اندر کی طرف بڑھتے ہوئے علی نے کہا۔

''ماما'' وہ حسب عادت چلایا۔''ماما کہاں ہیں'' قریب سے گزرتے ملازم سے مزید دریافت کیا'' کیوں چلا رہے ہو''۔ کہتے ہوئے سفید ساڑی میں ملبوس نرم مسکراہٹ لیے وہ کچن سے برآمد ہوئیں۔''ملازموں کی موجودگی میں آپ کچن میں کیا کر رہی ہیں۔ دیکھیے کون آیا ہے''۔ ماں کے گلے میں بانہیں حمائل کرتے ہوئے اس نے لاڈ سے کہا۔ نیلماں نے ادب سے سلام کیا۔ انھوں نے جواب دیتے ہوئے ایک بھرپور نظر سامنے کھڑی چینی کی گڑیا جیسی لڑکی پر ڈالی۔

''بیٹھو بیٹی۔'' اور خود بھی اس کے برابر بیٹھ گئیں۔

''علی تعارف تو کراؤ'' مسکرا کر کہا گیا۔

''ماما یہ نیلماں ہیں میرے ہی کالج میں پڑھتی ہیں۔ آپ سے ملنے کی بڑی آرزومند تھیں سو لے آیا''

''بہت اچھا کیا بہت پیاری بچی ہے۔'' ان کی آنکھوں میں واضح پسندیدگی تھی۔

''آپ باتیں کیجیے میں فریش ہو کر آتا ہوں'' علی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

زینت بیگم اس سے تعلیم کے بارے میں ہلکی پھلکی گفتگو کرنے لگیں۔ ملازم لوازمات سے پُر ٹرالی لیے آگیا۔

''بیٹی تمہارے پاپا کیا کرتے ہیں۔'' چائے کے دوران انہوں نے استفسار کیا۔

''پاپا ڈاکٹر ہیں ہارٹ اسپیشلسٹ۔'' اس کے لہجہ میں فخر تھا۔ جبکہ وہ خاموش سی ہو کر رہ گئیں۔'' کتنے بہن بھائی ہیں۔'' کچھ دیر رُک کر انہوں نے کہا۔

''آنٹی کوئی نہیں اکیلی ہوں اور ماں کو تو دیکھا تک نہیں''۔ نیلماں کا لہجہ اداس تھا۔

''بیٹی معاف کرنا نادانستگی میں میں نے تمھیں اداس کر دیا۔ آتی جاتی رہا کرو، میں علی کی ہی نہیں تمھاری بھی ماں ہوں''۔ لہجہ متاثر کن تھا۔

نیلماں کافی دیر بیٹھی۔ گفتگو میں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا کلاک پر نظر پڑتے ہی وہ واپسی کے ارادے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

علی اور نیلماں کے جانے کے بعد وہ دیر تک ایک ہی رُخ بیٹھی جانے کیا سوچتی رہیں۔ اچھا ہی ہوا وہ علی کی پسند سے آگاہ ہو گئیں ورنہ کہیں زبان دے بیٹھتیں تو مسئلہ ہو جاتا انہیں

رہ رہ کر نیلماں کی گہری گہری سیاہ آنکھیں یاد آجاتیں۔ کہیں دیکھی ہوئی آنکھیں جو آج بھی شعور میں زندہ ہوں۔ خیر کچھ بھی ہو وہ علی کی پسند کو اپنائیں گی۔ یہ آخری فرض ہے جس کی ادائیگی ان کے ذمہ ہے دوسرے ہی روز وہ علی کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی دل میں ہزاروں ارمان لیے نیلماں کے پاپا سے اس کا ہاتھ مانگنے جا رہی تھیں۔ ماں بیٹے کی پُر لطف گفتگو میں راستہ کٹ گیا علی نے گاڑی سیاہ گیٹ کے سامنے روکی۔

''کیا گھر آگیا''۔ ''جی ماما'' علی نے گاڑی بند کرتے ہوئے کہا۔ چادر ٹھیک کرتے ہوئے وہ پرسکون انداز میں گاڑی سے اتریں۔ ''ڈاکٹر شجاع آفریدی'' نیم پلیٹ پر نظر پڑتے ہی انہیں لگا زمین آسمان گول گول گھوم رہے ہوں۔ اپنے قدموں پر کھڑا ہونا دشوار ہو گیا۔ علی نے ان کی طرف دیکھے بغیر کال بیل کے لیے جیسے ہی ہاتھ بڑھایا انہوں نے گھبرا کر اسکا ہاتھ تھام لیا۔

''کیا ہوا ماما''۔ ان کے چہرے کی بدلتی رنگت دیکھ کر علی بری طرح گھبرا گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ماں کو سہارا دیا۔

''علی مجھے یہاں سے فوراً لے چلو'' بے ترتیب سانسوں کے درمیان انہوں نے کہا۔

''ٹھہریئے میں نیلماں کے پاپا کو لیکر آتا ہوں''۔ اس نے کال بیل کے لیے دوبارہ ہاتھ اٹھایا۔ ''نہیں علی نہیں بس گھر چلو''۔

علی نے سہارا دیکر انہیں پچھلی سیٹ پر لٹایا اور آندھی طوفان کی طرح بجائے گھر کے ہاسپٹل کا رُخ کیا ڈاکٹر انور ہاسپٹل کے جانے مانے قابل ڈاکٹر انہوں نے کافی توجہ سے معائنہ کیا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں کسی وقتی شاک سے دماغ متاثر ہوا ہے''۔ انہوں نے علی کو نسخہ دیتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں انہیں گھر لے جا سکتا ہوں''۔ علی نے غائب دماغی سے کہا ''آف کورس بس دوائیں پابندی سے دینا اور میڈم آپ بھی ٹینشن سے بچیں''۔ ڈاکٹر نے آخری جملہ زینت بیگم سے کہا۔

زینت بیگم سکون آور دواؤں کے زیر اثر رہیں لیکن علی نے وہ رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ ماں ہی تو اس کا سب سے بڑا اثاثہ تھیں عزیز رشتہ داروں سے تو ویسے بھی خالی تھا۔ ہر رشتہ ماں سے شروع ہو کر ماں ہی پر ختم ہوتا تھا۔ صبح اس نے نیلماں کو فون کر کے انکی طبیعت کے بارے

میں بتایا۔ وہ بری طرح پریشان ہوگئی ایک ہی ملاقات میں انکی اسیر ہوگئی تھی اور پھر وہ علی کی ماں تھیں جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔ اسکی پہلی اور آخری چاہت صبح کالج جانے کے بجائے وہ علی کے گھر پر تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے ماں کی''۔ علی کو دیکھ کر وہ تیزی سے قریب آئی ''پہلے سے بہتر ہے''۔ ''اور یہ تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا''۔ اس نے علی کی سُرخ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس ماما کی وجہ سے رات کو سو نہیں سکا''۔ آؤ۔ اس نے ماں کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا ''ماما نیلماں آئی ہے''۔ زینت بیگم بیڈ کی بیک سے سر ٹیکے خالی نظروں سے چھت کو دیکھ رہی تھیں بیٹے کی آواز پر نظروں کا زاویہ بدلا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولیں۔

''کیسی طبیعت ہے ماما آپکی''۔ نیلماں نے بیڈ کے کنارے پر ٹک کر دریافت کیا۔

''شکر ہے اوپر والے کا''۔ انداز میں واضح بے رخی و سرد مہری تھی جس کو سادہ دل نیلماں اور علی نے انکی طبیعت کی خرابی پر محمول کیا اور مطمئن ہو گئے۔

وہ بے چین اور مضطرب تھیں ذہن متضاد سر سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ یہ شادی ہر گز نہیں ہوسکتی میں اس کی بیٹی کو کسی حالت میں قبول نہیں کر سکتی۔ آج برسوں بعد قدرت نے یہ موقع دیا ہے اسکی بیٹی بھی زندگی بھر اسی آگ میں جلے گی انہیں انگاروں پر قدم رکھے گی جس میں جل کر آبلہ پائی میرا مقدر ٹھہرا۔ دل 'انتقام' 'انتقام' کی گردان کر رہا تھا۔ اسکی بیٹی کی بربادی کی زندگی میرے اندر کے بھڑکتے لاوے کو ٹھنڈا کر دیگی۔ کیا اس کے بعد تم سکون سے رہ سکوگی۔ اندر کہیں سے آواز آئی۔ ''ہاں''۔ انہوں نے آواز پر لبیک کہا۔ ہر گز نہیں یہ صرف تمہاری سوچ ہے تم نے علی کے بارے میں بھی سوچا جو تمہاری اولاد بیشک نہیں ہے لیکن تم اسکو اپنے جگر کا ٹکڑا مانتی ہو۔ علی کی پرورش اس کی تعلیم و تربیت میں تم نے اپنا آپ تج دیا۔ اپنا غم کسی کی بے وفائی، دربدری سب بھول گئیں یاد رہا تو صرف علی اور پھر اسکی ماں سے کیا ہوا وعدہ۔ پھر وہ بھی تو تمھیں ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ وہ بہت حساس ہے۔ نیلماں اسکی چاہت ہے وہ بکھر جائے گا وہ جو تمھارے جینے کا واحد سہارا ہے۔ اور اگر اس نے تمھارے انکار کی وجہ معلوم کی تو.......

میرے خدا مجھے کس امتحان میں ڈال دیا انہوں نے کروٹ بدل کر دونوں ہاتھوں سے

سر تھام لیا وہ تو ازل سے بدنصیب ہیں امید کی کشتی ہمیشہ ساحل کے قریب ہی ڈوبی ہے۔ برسوں سے کچھ بھی سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ تمام دن مصروفیت میں گذرتا رات کو تھکن سے نیند آ جاتی۔ لیکن آج رات کے اس پہر جبکہ تمام کائنات کالی چادر میں خوابیدہ تھی وہ ماضی میں پوری طرح ڈوب چکی تھیں۔ زندگی کے خوشگوار لمحات ہوں یا دکھ دینے والے حادثات آتے جاتے موسموں کے ساتھ کس طرح ماضی میں ڈھل جاتے ہیں۔ پیچھے مُڑ کر دیکھنے پر لگتا ہے ماضی ایک بہت بڑا گورستان ہے جس میں حسیں ارمانوں، خوش رنگ امیدوں اور خوبصورت آرزؤں کی کتنی ہی قبریں ہیں۔ زندگی کا کھویا ہوا ہر لمحہ اس گورستان میں موجود ہے کاش انسانی دماغ کی ساخت کچھ اس طرز کی ہوتی کہ وہ اپنا ماضی بھول سکتا تو آگے کی راہیں سہل ہو جاتیں۔ اف انسان سے زیادہ ''بیچاری'' کوئی دوسری مخلوق نہیں کاش وہ احساس کی حس سے ماورا ہوتا لیکن انسان تو پوری طرح اپنے ماضی سے جُڑا ہوا ہے۔

سلمٰی فراست خاں ایڈوکیٹ کی اکلوتی بیٹی اس کا کنبہ بھی بیحد مختصر تھا۔ شجاعت خاں اس کے تایا زمینوں کی دیکھ ریکھ کے لیے آبائی گاؤں محبوب نگر میں مقیم تھے۔ فراست خاں شہر میں پریکٹس کرتے تھے۔ منیزہ پھوپھو کم عمری میں بیوہ ہو کر ایک بچی نادیہ سمیت فراست خاں کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ محبوب نگر میں تعلیم کی سہولت نہ ہونے پر تایا کا اکلوتا بیٹا شجاع بھی شہر میں چچا کے پاس ہی رہتا تھا۔ سلمٰی اور نادیہ ہم عمر تھیں جبکہ شجاع پانچ سال بڑا۔ تایا نے سلمٰی کو پیدائش پر ہی شجاع کے لیے مانگ لیا تھا۔ تینوں آنکھ مچولی کھیلتے بچے کب شعور کی سرحد پر کھڑے ہو گئے وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ شعور کی دنیا میں قدم رکھتے ہی اس نے اپنے نام کے ساتھ شجاع کے نام کی بازگشت سنی اور وہ سلمٰی کے دل پر نقش ہو گیا۔ نادیہ اسکی پھوپھی زاد اس سے بہت پیار کرتی دونوں کلاس فیلو بھی تھیں۔ ہمراز سہیلیاں بھی۔ سلمٰی کا زیادہ وقت نادیہ سے شجاع کی باتیں کرتے گزرتا وہ کوئی انوکھی نہیں تھی عمر کے اس دور میں تھی جب خواب خود بخود آنکھوں میں بسنے لگتے ہیں ارمان انگڑائیاں لیکر بیدار ہونے لگتے ہیں۔

شجاع بیحد وجیہ نوجوان تھا اس کے چہرے پر سب سے خوبصورت اسکی سیاہ بھونرا جیسی گہری آنکھیں تھیں جو مخاطب کو پل بھر میں اپنا اسیر کر لیتی تھیں وہ تو بچپن سے دیکھتی چلی آ رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں سلمیٰ کو اپنا آپ نظر آتا تھا۔ نہ جانے لڑکیوں کو اتنا یقین کیوں ہوتا ہے کہ جس کو دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہیں وہ بھی ان کے پیار میں اتنا ہی پاگل ہوگا اسی خوش فہمی میں ان کی محبت جنون کی حد میں داخل ہو جاتی ہے جب وقت کی دھول میں اٹی وہ خالی ہاتھ کھڑی رہ جاتی ہیں تب یہی مرد انہیں ناقص العقل کے خطاب سے نوازتے ہیں ابھی سلمیٰ اور نادیہ فرسٹ ایر میں تھیں کہ شجاع نے میڈیکل کی تعلیم مکمل کر لی وہ ہارٹ سرجن بننا چاہتے تھے اسپلائزیشن کے لیے امریکہ جانا ان کا خواب تھا۔ تایا اکلوتے بیٹے کو ہزاروں میل دور بھیجنے کے حق میں نہیں تھے لیکن فراست خاں نے اپنی دلیلوں سے انھیں راضی کر ہی لیا حالانکہ بھتیجے سے انھیں بھی بے تحاشہ محبت تھی سب سے بڑھ کر اکلوتی بیٹی کا مستقبل اس سے وابستہ تھا۔ شجاع کے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں لیکن سلمیٰ پر کیا بیت رہی تھی یہ وہی جانتی تھی یا اس کا خدا۔ جدائی کی تو ایک گھڑی بہت ہوتی ہے یہاں تو درمیان میں پانچ سال کا وقفہ زندگی اسکی دید سے عبارت تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوتیں کھانا پینا چھوٹ گیا تھا۔

وہ میز پر کہنیاں ٹکائے ہاتھوں کے پیالے میں سر رکھے بے آواز آنسو بہاتی رہتی تھی تبھی شجاع کسی کام سے اندر آئے۔ سلمیٰ کو روتا دیکھ کر ان کے قدم جم گئے وہ آہستہ چلتے ہوئے قریب آئے جیب سے رومال نکال کر اس کے آنسو صاف کیے۔ ''سلمیٰ کیا تمھیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے'' لہجہ محبتوں سے پُر تھا۔

''آپ پر تو اعتماد ہے''۔ ''پھر''۔ ''پانچ سال کیسے گزرینگے'' وہ اور شدت سے رو دی۔ وہ اس کے برابر بیٹھ گئے۔ سلمیٰ جانتی ہو تمہارے آنسو میری سب سے بڑی کمزوری ہیں۔ اگر ایسے ہی روتی رہیں تو میں اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ میں برابر خط لکھتا رہونگا فون پر ہم لمبی گفتگو کیا کرینگے چٹکی بجاتے ٹائم گزر جائے گا پھر ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائینگے۔

شجاع چلے گئے اسے لگا زندگی اجاڑ ہو کر رہ گئی۔ ایسے میں شجاع کے خطوط ہی بہار کا خوشگوار جھونکا ہوتے تھے۔ وہ بہل جاتی تھی۔ وقت کا کام گزرنا ہے شجاع کو گئے چار سال بیت گئے تھے اب اس کے اور تایا کے گھر میں شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو گئیں تھیں ایسے میں وہ بھیانک حادثہ ہوا جس نے اس کی دنیا تہہ و بالا کر دی۔ اس کے والدین کسی دوست کے بیٹے کی شادی میں

شرکت کے لیے نکلے اسے بھی ساتھ لیجانا چاہتے تھے۔ لیکن اگلے دن ٹیسٹ کی تیاری کے سبب وہ نہ جاسکی۔ واپسی میں ان کی کار کسی آئل ٹینکر سے ٹکرا گئی۔ تین روز کی بے ہوشی کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ تایا، تائی، نادیہ، پھوپھو بھی اس کے قریب تھے۔ تایا اسے ہوش میں دیکھ کر اس پر جھک گئے۔ ''کیسی ہے میری بیٹی''

اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری لگ گئی۔ سبھی کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ تیز بخار کی غفلت سے ایک بار پھر وہ ہوش سے بیگانہ ہوگئی۔

اس کا بخار مستقل صورت اختیار کرتا جارہا تھا ڈاکٹروں نے ٹائفائڈ تجویز کیا۔ ایسے میں نادیہ نے دل وجان سے اسکی خدمت اپنے اوپر فرض کرلی۔ وہ سایہ کی طرح ہر وقت اس کے ساتھ رہتی۔ سلمٰی کمزور سے کمزور ہوتی چلی گئی رنگ بھی سانولا گیا کلائی کی چوڑیاں کہنیوں تک آنے لگیں چہرے کی تازگی اور شادابی رخصت ہوگئی۔ تایا تائی اسکی حالت کے پیش نظر مستقل یہیں مقیم تھے والدین کی ابدی جدائی معمولی حادثہ نہیں تھا لیکن قانونِ قدرت رفتہ رفتہ صبر آتا گیا۔ لیکن تقدیر کے ترکش میں ابھی ایک تیر اور باقی تھا۔ دل کے مریض شجاعت خاں عزیز بھائی کی جدائی زیادہ دن سہہ نہ پائے اور ایک رات خاموشی سے ابدی نیند ہو گئے۔ ایک بار پھر وہ ہوش وخرد سے بیگانہ تھی۔ شجاع کے آنے میں دو تین ماہ باقی تھے۔ شجاعت خاں نے بھائی کے حادثہ کی اطلاع اسے نہیں دی تھی کہ اکیلا دیار غیر میں ہے اس کے پاس تو کوئی کندھا بھی ایسا نہیں ہے جس پر سر رکھ کر رو سکے تائی نے بھی یہی سوچ کر اسے باپ کی موت سے لاعلم رکھا۔

سلمٰی اب مکمل لاوارث تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا ایسے میں صرف شجاع کا تصور روشنی کی ایک کرن تھا۔ نادیہ اسے بہلانے اور زندگی سے قریب لانے میں ہمیشہ شجاع کا ذکر کر چھیڑتی رہتی ''سلمٰی اپنا خیال رکھا کرو تمھارے چہرے کی تو ساری تازگی ہی ختم ہوگئی شجاع بھائی تو تمہیں مشکل سے پہچان پائینگے''۔

''نہیں نادیہ چہروں سے کیا ہوتا ہے محبت تو روح کی گہرائیوں میں پنہاں ہوتی ہے''۔ وہ جواب میں کہتی۔ ''تمھارا کہنا ٹھیک ہے لیکن حسن شجاع بھائی کی کمزوری ہے اور دیکھو سلمٰی حکم خداوندی کے سامنے بندہ بے بس ہے جسکا جس وقت بلاوا آ گیا اسے جانا ہی ہے۔ مجھے دیکھو مجھے

تو اپنے پاپا یاد بھی نہیں۔"

شجاع آ گئے ماحول ایک بار پھر سوگوار ہو گیا۔ انہوں نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ باپ اور چچا کا سایہ اس طرح سر سے اٹھ جائیگا۔ بیوہ ماں، سوگوار پھوپی اور نڈھال سلمیٰ کو دیکھ کر وہ ضبط نہیں کر سکے اور بچوں کی طرح رو دیے۔ چند روز اسی طرح گزرے۔ ایسے میں تائی کی خواہش تھی کہ وہ جلد سے جلد شجاع اور سلمیٰ کو ایک کر دیں وہ سلمیٰ کی دگر گوں حالت دیکھ رہی تھیں۔ ارمان اور خوشیاں تو جانے والے ساتھ لے گئے۔ سادگی سے عقد و رخصتی ہو جائے۔ انہوں نے شجاع سے بات کی۔ لیکن وہ اتنی جلدی شادی کے حق میں نہیں تھے۔

"امی مجھے اپنے پیروں پر تو کھڑا ہونے دیجئے پھر پاپا اور چچا کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں دنیا کیا کہے گی انہوں نے ماں کو مطمئن کر دیا۔

ایک صبح سورج حسب معمول دنیا کو منور کرنے نکلا تو ضرور لیکن اس کی زندگی میں ابدی اندھیرا چھا گیا۔ وہ یقین اور بے یقین کے دوراہے پر کھڑی تھی اس نے جو کچھ سنا وہ حقیقت تھی یا سماعت کا دھوکا۔ وہ محبت کی شدتیں، پیار بھرے جذبے، والہانہ انداز صرف پانی کے بلبلے تھے سطح آب پر ابھرے اور فنا ہو گئے۔ اس کے سارے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے صبح اُٹھنے کے ساتھ ہی اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد تھا وہ اپنے کمرے سے نکل کر لاونج میں آئی کہ نادیہ کے کمرے سے آنے والی آوازوں نے اس کے قدم جکڑ لیے۔

"تمھارا نام نادیہ کس نے رکھا"۔ شجاع کی آواز تھی۔

"ظاہر ہے ماں باپ نے"۔

"میرا دل چاہتا ہے تمہیں رعنا کہا کروں"۔ الفاظ نہیں طاقتور بم تھے جس نے اس کی ہستی کو تہس نہس کر دیا۔ محبت کی عمارت اعتماد کے ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے ستونوں کے گرنے پر عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ شجاع نے کئی بار یہی الفاظ اس سے کہے تھے تو شجاع کو صرف اور صرف رعنائی کی تلاش ہے۔ اُس نے تو اس کو روح کی گہرائیوں سے چاہا تھا اور شجاع نے ایک جھٹکے میں وہ بندھن توڑ دیا جو شعور کے ساتھ روح نے باندھا تھا۔

اسے لگا زمین سکڑ کر بہت چھوٹی ہو گئی ہو وہ یہاں ہرگز نہیں رہے گی اس کا اعتماد صرف

مرد پر سے نہیں ساری انسانیت سے اُٹھ گیا تھا رشتے ناتے خون کی شراکت محض فریب نظر ہے لیکن وہ کیا کرے کہاں جائے ایسے میں اسے اپنی واحد دوست زینت یاد آئی چند ماہ گزرے اس کا خط آیا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ ایک خوبصورت بیٹے کی ماں بن گئی۔ وہ زینت کے پاس چلی جائے گی اس کی مدد سے کہیں سروس وغیرہ کر لیگی دنیا میں سیکڑوں لوگ تنہا جیتے ہیں ایک وہ بھی سہی۔ اس نے رات ہی میں اپنے چند جوڑے سرٹیفکٹ اور راستے کے اخراجات کے لیے کچھ رقم رکھی وہ صبح سب کے جاگنے سے پہلے اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ ایک مختصر خط اس نے نادیہ کے نام لکھا۔

''نادیہ میں جا رہی ہوں ہمیشہ کے لیے شجاع تمھیں مبارک ہو لیکن اگر تمھاری رعنائیاں ختم ہو جانے کے بعد اسے کوئی اور رعنا نظر آ جائے تو یہ دل مت ہونا میری طرح مرد کی فطرت کا یہ بھی ایک پہلو ہے..... سلمیٰ۔

اُس نے منھ اندھیرے گھر پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور روانہ ہوگئی۔ ہر لڑکی ایک دن بابل کی دہلیز چھوڑتی ضرور ہے اس کے ساتھ زندگی کا ہمسفر ہوتا ہے والدین کی دُعائیں سہاگ کے الوداعی گیتوں کا تاثر ہوتا ہے۔ پر اس کا دل اور ہاتھ دونوں خالی تھے۔ شام سے قریب وہ زینت کے گھر پہنچ گئی لیکن آہ یہ کیا! زینت ملی بھی تو کس طرح سفید لباس، سونی کلائیاں، تیل کنگھے سے بے نیاز بال وہ ابھی اس کے اجڑے حلیے پر غور ہی کر رہی تھی کہ زینت کی نظر اس پر پڑی وہ دوڑ کر آئی اور اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی کافی دیر بعد جب دل کا غبار ہلکا ہوا وہ اسے لیے صوفے پر ٹک گئی۔

''یہ سب کیا ہے زینت شہریار بھائی کہاں ہیں؟۔

تب ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان زینت کے جو کچھ بتایا وہ سلمیٰ کے ہوش اُڑانے کو کافی تھا شہریار اکلوتے تھے ماں کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا صرف والد تھے۔ انکا اصل وطن حیدرآباد تھا سروس یہیں کرتے تھے وہ ایک کامیاب انجینئر تھے۔ یہیں ان کی زینت سے ملاقات ہوتی جو جلد ہی بے پناہ چاہت میں تبدیل ہوگئی۔ انہوں نے گھر جا کر والد کو اس شادی پر آمادہ کرنا چاہا لیکن وہ سنتے ہی آگ بگولہ ہو گئے شہریار نے بہت خوشامد کی لیکن انہوں نے عاق کرنے کی

دھمکی دی تب وہ خالی ہاتھ لوٹ تو آئے لیکن اپنی ضد کے پکے تھے چند دوستوں کی موجودگی میں انہوں نے زینت کو شرعی طور پر اپنا لیا۔ والد نے قطع تعلق کر لیا۔ چند ماہ پیشتر ان پر فالج کا حملہ ہوا سنتے ہی شہریار روانہ ہو گئے باپ کو معذور دیکھ کر برداشت کھونے لگے دونوں کے آنسوؤں نے ناراضگی کے غبار کو دھو دیا۔ پوتے کی خوش خبری سن کر بڑے میاں بہت خوش ہوئے اور فوراً بہو اور پوتے کو لانے کا حکم صادر کر دیا۔ وہ خوشی خوشی آئے ہم دونوں نے مل کر جانے کی تیاری شروع کر دی لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا طویل رخصت کی درخواست لیکر وہ آفس کے لیے نکلے راستے میں دو پارٹیوں میں جھگڑا ہو رہا تھا جو اسلحہ سے لیس تھیں۔ ایک گولی پر شہریار کا نام لکھا جا چکا تھا۔ شہادت ان کا مقدر تھی۔ میری دنیا اندھیر ہو گئی تم تو جانتی ہو سلمٰی ماں باپ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مجھے چھوڑ گئے۔ ماموں نے دنیا دکھاوے کو رکھا ضرور لیکن بیوی کی ٹھوکروں سے نہ بچا پائے۔ میں نے شہریار کے والد کو اس سانحے کی اطلاع دی انہوں نے مجھے اپنے بچے کے ساتھ فوراً بلایا ہے۔ اب تم بتاؤ تمھیں میری یاد کیسے آ گئی۔ تمھارے شجاع تو غالباً امریکہ سے آ گئے ہونگے تب سلمٰی نے جو کچھ بیتی تھی کہہ سنائی "مجھے نہیں معلوم تھا تم پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ میں تو یہ سوچ کر آئی تھی کہ شہریار بھائی کہیں سروس وغیرہ کا بندوبست کر دینگے"۔ سلمٰی نے بھیگے لہجے میں کہا۔ زینت کو اپنی دوست کے دکھوں کا اندازا تھا۔

"سلمٰی میں ابھی زندہ ہوں تم میرے ساتھ حیدرآباد چلو"۔ زینت نے آفر کی

"نہیں ان حالات میں میں تم پر بوجھ نہیں بننا چاہتی"۔

"بوجھ کیسا وہاں تمھاری سوچ کے مطابق تمھیں کوئی سروس مل جائے گی۔ میرا بھی دنیا میں کون ہے جسے اپنا کہہ سکوں اور تم بھی ساری کشتیاں جلا چکی ہو۔"

سلمٰی راضی ہو گئی کہ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ ٹرین تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف رواں تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا اس نے اپنے اطراف نظر ڈالی زینت تین ماہ کے بچے کو سینے سے لگائے اپنی برتھ پر سو رہی تھی دوسرے مسافر بھی اپنی اپنی برتھوں میں دراز گہری نیند میں تھے ایک وہی جاگ کر قسمت کی نیرنگی پر غور کر رہی تھی کہ ٹرین کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ سوئے ہوئے مسافر بدحواس ہو کر جاگ پڑے۔ اگلے پل کچھ ہوش نہیں۔ آنکھ کھلی تو اپنے کو ہاسپٹل کے

بیڈ پر پایا۔ اردگرد شوروغل آہ و بکا کا طوفان تھا۔ وہ زیادہ زخمی نہیں تھی کندھے اور بازو پر زخم تھے۔جسکی ڈریسنگ کردی گئی تھی۔ بیڈ سے اٹھ کر بے تابی سے زینت کو تلاش کیا۔ تلاش بسیار کے بعد وہ ملی بھی تو کس حالت میں زخموں سے چور منھ اور ناک سے بہتے لہو میں تر بتر تین ماہ کا بچہ اس کے پہلو میں۔ ''آہ یہ کیا ہو گیا اس کی بدنصیبی کا سایہ اس کی عزیز دوست پر بھی پڑ گیا۔

''زینت، زینت''۔وہ پوری طاقت سے چلاّ اٹھی''۔

''زینت نے بدقت آنکھیں کھولیں ''سلمیٰ میرے پاس مہلت بہت کم ہے میری بات غور سے سنو''۔

''ایسے مت کہو زینت تم ٹھیک ہو جاؤ گی''۔ وہ بلک کر رو دی۔

''نہیں سلمیٰ تسلی کا وقت ختم ہو چکا ہے بس جلدی سے میری ایک التجا سن لو میری روح روزِ آخر تک تمھاری احسان مند رہے گی میرا وقت پورا ہو چکا ہے میرے بعد میرے معصوم بچے کو اپنا لینا مجھے حیدر آباد میں کسی نے نہیں دیکھا ہے تم علی کو لیکر شہریار کی بیوہ کی شکل میں وہاں جاؤ گی''۔

''لیکن زینت''.......

لیکن ویکن کچھ نہیں زینت نے اپنا زخمی ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیا۔

''سلمیٰ تم مجھے خودغرض کہہ سکتی ہو لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے''۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا ایسے نازک وقت میں سوچنے اور غور کرنے کی تمام صلاحتیں فریز ہو گئی تھیں۔

زینت نے اپنے زخمی ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔ ''سلمیٰ علی کو کبھی نہ معلوم ہو کہ وہ باپ کے بعد ماں کی ممتا سے بھی محروم ہو چکا ہے میرا بچہ ٹوٹ جائے گا۔خدا کو حاضر ناظر جان کر مجھ سے وعدہ کرو تم زندگی کی آخری سانس تک میرے علی کو ممتا دو گی کبھی اسکی آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دو گی اس نے زینت کے بندھے ہاتھوں پر اپنی پیشانی ٹیک دی۔ زینت شاید یہ سب کہنے کے لیے ہی زندہ تھی اسکی روح پر سکون ہو کر مالک حقیقی کی جانب پرواز کر گئی۔اسکی کھلی آنکھیں سلمیٰ کے چہرے پر مرکوز تھیں.......

پھر وہ کنواری ماں، کنواری بیوہ اور کنواری بہو بن گئی۔ زماں نیازی کی اتنی خدمت کی

کہ وہ دُعائیں دیتے نہ تھکتے اور علی میں تو انکی جان تھی اکثر کہتے'' دیکھو زینت علی شہر یار کی دوسری کاپی ہے''۔ وہ کیا جواب دیتی اس نے شہر یار کو دیکھا ہی کب تھا۔ البتہ یہاں آ کر اس کے فوٹو ضرور دیکھے تھے۔ ایک سہمی ہوئی اداسی اس کا احاطہ کیے رہتی ۔ چند ماں ہی گذرے تھے کہ زماں صاحب نے بھی سفر آخرت اختیار کیا۔ اسے لگا کوئی سایہ سر سے ہٹ گیا۔ انکی کافی آبائی زمینیں اور ایک آئرن فیکٹری تھی جس کو مرنے سے کچھ پہلے وہ علی کے نام کر گئے تھے۔ مینجر محمد رضا انتہائی ایماندار اور مخلص انسان تھے اس طرف سے تو وہ بہر حال مطمئن ہوگئی۔ اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا کیونکہ عورت اور سمجھوتہ تو ہمیشہ سے لازم اور ملزوم رہے ہیں۔ عورت کا دوسرا نام ہی سمجھوتہ ہے۔ کبھی کبھی تو وہ ایسا محسوس کرتی کہ وہ حقیقت میں وہ علی کی ماں اور شہر یار کی بیوہ ہو۔ تقدیر بھی عجب شے ہے انسان کو لمحوں میں کیا سے کیا بنا دیتی ہے کون اجڑا کون بسا تقدیر کو اس سے کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ علی اب پیر پیر چلنے لگا تھا اور اس کو ماما کہنے لگا تھا۔ لفظ 'ماما' پر جہاں وہ سرشار ہوتی وہیں تقدیر کے انوکھے مذاق پر ہنسی آجاتی عورت کتنی منزلوں سے گذرنے کے بعد اس لفظ کی بازگشت سنتی ہے۔ وہ بے اختیار اس کو بازوؤں میں بھر کر چوم لیتی۔ کبھی وہ ڈگمگانے لگتی اس کے تصور میں خون آلود چہرے کے درمیان دو آنسو بھری آنکھیں آجاتیں لگتا زینت کی آنکھیں ہر لمحے اس کی نگرانی کر رہی ہوں۔ یا پھر نام کے ساتھ ساتھ زنیت کی روح اس کے جسم میں حلول کر گئی ہو۔

وقت بغیر آہٹ کیسے گزرتا رہا علی اس کے قد سے کہیں اونچا ہو گیا۔ دل مر جائے تو زندگی ٹھہر جاتی ہے عمر البتہ وقت کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ اس کے سر میں چاندی کے تار جھلملانے لگے۔ علی اس کو دیوانہ وار چاہتا تھا اس نے آج تک کسی بیٹے کو ماں کے لیے ایسا جنونی نہیں دیکھا تھا۔ اور پھر اس نے تو اسے جنم بھی نہیں دیا تھا۔ علی اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا تھا۔ تو کیا وہ علی سے یہ قربانی مانگ لے۔ اس کی سوچیں پھر وہیں پہنچ گئیں جہاں سے شروع ہوئی تھیں وہ علی کی جذباتیت سے واقف تھی وہ ٹوٹ کر بکھر جائے گا لیکن اُف نہیں کریگا۔ زینت کی روح کس قدر بے چین ہوگئی پھر اسکی عمر بھر کی ریاضتیں۔ آہ حالات نے اسکو کس دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔

کل وہ کسقدر مسرت کے ساتھ نیلماں کا ہاتھ مانگنے جا رہی تھی۔ لیکن نیم پلیٹ پر نظر پڑتے ہی اسے لگا وہ کسی جنگل کے اجاڑ مندر کے دروازے پر کھڑی ہوں جہاں چٹانوں سے تراشا ہوا دیوتا رہتا ہو۔ احساسات سے ماورا جذبات سے پرے ضبط کی جو چادر برسوں سے اس نے لپیٹ رکھی تھی اس میں شگاف پڑنے لگے وہ تو اس کی ذات کی گمشدہ کڑی تھا۔ اس نے اسکی انمول چاہتوں کو خس وخاشاک کی طرح قدموں تلے روند دیا تھا ساری آرزوئیں اپنی موت آپ مرگئی تھیں۔ کیا وہ آج بھی اس بے وفا کی محبت کی اسیر ہے۔ خلیل جبران نے کہا ہے کہ محبت اپنی گہرائیوں سے اس وقت تک بے خبر رہتی ہے جب تک کوئی حادثہ اسے بیدار نہ کردے انجانے میں وہ حادثہ ہو چکا تھا۔

کیا اب تک وہ شجاع کو چاہتی چلی آرہی ہے اسکی دھڑکنوں میں شجاع کا نام قید ہے شاید ہاں کہ عورت زندگی میں صرف ایک بار پیار کرتی ہے۔ اس نے زور سے آنکھیں بند کرلیں لیکن وہاں شجاع نہیں علی کی سبیہ تھی اداس، مایوس، ٹوٹا، بکھرا کیا وہ علی کو ایسا دیکھ پائیگی۔ نہیں وہ ایک عزم کے ساتھ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور دونوں ہاتھ جوڑ کر التجا کی یا پروردگار مجھے استقامت عطا فرمایا مجھے ہمت دے سلمٰی تو اسی روز مرچکی تھی جس روز اس کی زباں مجروح ہوئی تھی اعتماد کی کرچیاں بکھری تھیں یہ چلتی پھرتی لاش تو علی کی ماما شہریار کی بیوہ ہے۔ وہ زینت ہے کل ہی وہ شجاع سے نیلماں کا ہاتھ مانگے گی۔ الٰہی میری ذات کا بھرم رکھنا............

واپسی

خدا جانے نیند کو مجھ سے کس جنم کا بیر ہے۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر جیسے ہی بستر پر لیٹی نیند مجھ سے کسی ایسے ضدی بچے کی طرح روٹھ کر دور جا کھڑی ہوتی جس کی ماں نے کسی شرارت پر تھپڑ رسید کر دیا ہو۔ باوجود چمکارنے کے وہ ماں کے قریب آنا نہ چاہتا ہو۔ نیند کی اس آنکھ مچولی کو میں برسوں سے بھگت رہی ہوں کاش یہ بھی نرم بستر کی طرح پیسوں سے خریدنے والی کوئی چیز ہوتی۔ پیسوں پر مجھے یاد آیا جلدی سے سرہانے نظر ڈالی سلیپنگ پلز کی شیشی موجود تھی۔ بھلا ہو موجودہ سائنس کا۔ میری نیند اس شیشی میں بند تھی بے صبری سے شیشی کھولی حسب عادت بسم اللہ اور ھوالشافی کہہ کر گولی منہ میں رکھی سرہانے سے گلاس اٹھا کر حلق سے نیچے اتار لی۔ اور دل ہی دل میں اس کمبخت نیند کو نیچا دکھا کر مطمئن ہو گئی کہ اب کیسے نہیں آئے گی۔ لیکن اگلے پل کیا ہونے والا ہے؟ کوئی نہیں جان سکتا غیب کا علم صرف عالم الغیب ہی کو ہے۔ نجومی، رمال، جفار غیب دانی کا دعویٰ کرنے والے محض جھوٹے پرلے درجے کے مکار ہیں۔ حضرت موسیٰ جیسے جلیل القدر نبی جن کو اللہ تعالی بزرگ برتر سے ہمکلائی کا شرف بھی حاصل تھا زندگی بھر اس خیال سے مکان نہیں بنایا کہ کب بلاوہ آجائے۔ لاکھوں روپیہ کی لاگت سے عالیشان کوٹھیاں تعمیر کرنے والے یہ تعین نہیں کر سکتے کہ مکمل ہونے پر وہ ایک رات بھی اس میں بسر کر پائینگے۔ قتل کی سپاری دینے والے اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ دشمن سے پہلے ان کا بلاوہ آجائے۔ اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا ایک وہمی بادشاہ نے دربار کے شاہی نجومی سے دریافت کیا کہ اسکی کتنی عمر باقی ہے نجومی نے زائچہ درست کیا ستاروں کی چال دیکھی اور ہاتھ جوڑ کر بولا "حضور گستاخی معاف آپکی زندگی کے صرف دو ہفتے باقی بچے ہیں"۔ موت کے خوف سے بادشاہ لرزہ براندام ہو گیا۔ وزیر بھی موجود تھا سوچنے لگا کہ بادشاہ کو اس واہمے سے کیسے نکالے اس نے نجومی سے کہا "اپنا زائچہ دیکھ کر بتاؤ تمھاری کتنی عمر باقی ہے "۔ نجومی نے دوبارہ پوتھی کھول کر زائچہ بنایا اور وزیر سے کہاں حضور میں ابھی بیس سال زندہ رہونگا۔ وزیر نے میان سے تلوار نکالی اور نجومی کا سر قلم کر دیا۔ بادشاہ کے استفسار پر وزیر نے

دست بستہ عرض کی۔

''حضور اس نامراد کو جب یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ پل بھر کا مہمان ہے تو وہ آپ کی عمر کے بارے میں کیسے بتا سکتا تھا''۔اس طرح عقلمند وزیر نے اپنے بادشاہ کو موت کے خوف سے آزاد کرا دیا۔

ہاں تو کہنا ہے کہ انسان سالوں کے منصوبہ بناتا ہے اور اگلے پل سے بے خبر ہے۔

میں نے تکیہ پر سر رکھا ایک سچے مسلمان کی طرح کلمہ طیب پڑھا۔ چند قرآنی آیات کا ورد کیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک خوفناک آواز نے لرزہ براندام کر دیا۔

''اٹھ ہمارے ساتھ چل''۔

''کون ہو بھائی کہاں چلوں''؟ میرے لبوں کو جنبش ہوئی۔

''کوئی سوال نہیں تیری مدتِ حیات پوری ہو چکی بلاوہ آچکا ہے۔'' کرخت آواز میں جواب ملا۔

''لیکن ایسی بھی کیا جلدی ہے ابھی تو بہت سے کام ادھورے ہیں'' میں نے جان پر کھیل کر کہا۔

''کون سے کام؟ وہی جو تو دن رات اوراق کو سیاہ کرنے میں وقت کو ضائع کرتی ہے''۔ بڑی بیدردی سے جواب آیا۔

''جی ہاں، جی نہیں میں درحقیقت سہم گئی تھی۔

''جانتی ہے ہر ذی روح کو یہاں سے ایک نہ ایک دن جانا ہوتا ہے۔ باتوں میں مت لگا مجھے ابھی اوروں کو بھی لیجانا ہے''۔ عجلت سے جواب ملا۔

عالم بالا جانے کی ہیبت اپنی جگہ مجھے یہ فکر تھی کہ بہت سی تخلیقات ادھوری تھیں بعض تو کلائمس کے قریب ترتھیں۔ کوئی وارث علم وادب کا ایسا شیدائی نہیں تھا جو مکمل کر دیتا۔

''ٹھیک ہے میں چلنے کو تیار ہوں اگر آپکی اجازت ہو تو ایک قلم اور فائل ساتھ لیلوں''۔ میں نے ملتجی لہجہ میں کہا۔

''خاموش، یہاں ہر شخص خالی ہاتھ آتا ہے اور خالی ہاتھ واپس جاتا ہے ہاں، اگر کچھ

ساتھ ہوتا ہے تو اسکے اعمال۔ بحث کرنا لا حاصل تھی۔ مشہور کہاوت مرتا کیا نہیں کرتا آج پوری طرح مجھ پرفٹ ہو رہی تھی۔ ''ٹھیک ہے''۔ میں نے مری مری آواز میں جواب دیا۔

اچانک مجھے احساس ہوا میں فضا میں تیرتی ہوئی اونچی ہوتی چلی جا رہی ہوں۔ میرا ایک ہاتھ فرشتے کے (جو غالباً حضرت عزرائیل علیہ السلام ہی رہے ہونگے) ہاتھ میں تھا۔ آنکھوں سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا البتہ محسوسات میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اچانک سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔

''بھائی یہ کیا مقام ہے میرا دم کیوں گھٹ رہا ہے''۔ میں نے بدقت کہا۔

''چپ نہیں رہا جاتا خلا میں آکسیجن نہ ہونے پر ایسا ہی ہوتا ہے''۔ حسب حول کرخت جواب ملا۔ ''اوہ! تو میں خلا میں ہوں کاش زندگی دوبارہ مل سکتی اور میں واپس دنیا میں جاتی کیسا شاندار استقبال ہوتا''۔ ''سنیتا ولیمس'' سے کہیں زیادہ شاندار۔

اخباروں کی سرخیاں ہوتیں ''ہندوستان کی پہلی مسلم خاتون کی خلا سے واپسی''۔ میرے اطراف اخباروں کے رپورٹر مختلف ٹی۔وی پر انٹرویو دکھایا جاتا۔ میرے بیٹے بہوویں پڑوسی، رشتہ دار (چند ایسے رشتہ دار بھی جو مفلوک الحال کے سبب مجھے رشتہ دار بتانے سے کتراتے ہیں) سب کے سب کتنا فخر محسوس کرتے۔ لیکن ہائے قسمت اب کیا ہوسکتا ہے۔

اچانک ہی گھٹن کے بجائے شدید گرمی اور تپش کا احساس ہونے لگا۔ جون کی تپتی دوپہر سے زیادہ تپش ''کیوں یہ گرمی کیسی ہے''۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔

''اُف بک بک کر کے دماغ چاٹ لیا میں ہرگز نہیں بتاؤنگا کہ ہم سورج کے قریب سے گزر رہے ہیں تپش نہیں تو کیا سائبیریا جیسی ٹھنڈک ہوگی''۔

میں نے سختی سے اپنا منھ بند کرلیا۔ کچھ دور اور چلنے کے بعد عزرائیل رک گئے۔ سامنے ایک عظیم ترین انسانی تخیل سے بھی بڑا دروازہ تھا۔ شاید میری منزل آچکی تھی۔ انہوں نے مجھے اندر کی طرف اس طرح سے اُچھالا جیسے بالر بیٹ کی طرف گیند اچھالتا ہے میں نے خوف سے آنکھیں بند کرلیں اب میری ہڈیوں کا سرمہ بننے والا ہے۔ لیکن یہ کیا! میرے جسم پر ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا ہر طرف ہجوم تھا۔ شہد کی مکھیوں جیسی

بھنبھناہٹ۔ایک خاص بات ہجوم میں صرف مستورات ہی تھیں میں نے اس قدر مستورات کو یکجا کبھی نہیں دیکھا تھا۔

مرنے والوں میں تو مرد عورت دونوں ہی شامل ہیں پھر آخر مرد حضرات کیا ہوئے۔ ''کس سے معلوم کروں''۔اس ہجوم میں چند فرشتے تیزی سے آجا رہے تھے۔میں نے سوچا انہیں مخاطب کروں لیکن کیا کہہ کر صرف فرشتہ کہنا تو غیر مناسب ہے۔جناب،فرشتے،نہیں ٹھیک نہیں فرشتے صاحب،نہیں یہ بھی عجیب سا لگ رہا ہے پھر سَر sir کہوں۔مجھے اپنی سوچ پر ہنسی آگئی آدھی صدی سے زیادہ گزر گئی آزاد ہوئے۔انگریز چلے گئے اور سَر چھوڑ گئے۔ایسے ہی جیسے چچا جان کو انگریز اپنے ساتھ لے گئے اور انکل کو ساتھ چھوڑ گئے۔اچانک ایک بڑا خوبصورت اور پاکیزہ لفظ ذہن میں گونجا ''بھائی''۔بس ٹھیک ہے بات بن گئی۔میں نے قریب سے گزرتے دو فرشتوں میں سے ایک کو مخاطب کیا۔''فرشتے بھائی ایک بات معلوم کرنا ہے''۔''پوچھو''اس نے قدرے نرمی سے کہا شاید یہ لفظ بھائی کی تاثیر تھی۔

یہاں مرد حضرات نظر نہیں آرہے آخر موت تو انہیں بھی آئی سیکڑوں بندۂ خدا میرے سامنے دنیا سے گئے پھر وہ کیا ہوئے''۔

''یہ دنیا نہیں آخرت کا میدان ہے یہاں مردوں کا محکمہ الگ اور عورتوں کا الگ ہے''

فرشتے کے اس جواب پر مجھے اپنے شہر کی بے شمار مارکیٹس اور گیدرنگ یاد آگئیں جہاں دونوں شانہ بشانہ نظر آتے تھے۔چلو یہ حساب کتاب ٹھیک ہے۔

اچانک ہی زور کی گرج سے میری سوچوں میں بریک لگ گئے۔ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ایک فرشتہ تیزی سے تمام خواتین کو گروہوں میں تقسیم کرنے لگا۔

''اوہ تو گروہ بندی نے یہاں بھی یعنی مر کر بھی پیچھا نہیں چھوڑا''۔میں نے زیر لب کہا مجھے بھی چند خواتین کی صف میں کھڑا کر دیا گیا۔

''آپ لوگ کون ہیں''میں نے قریب کھڑی ایک صاحبہ سے دریافت کیا۔انہوں نے مجھے کچھ اس طرح گھور کر دیکھا جیسے میں نے ان سے عمر پوچھنے کی گستاخی کی ہو۔''یہ شاعرات اور تخلیق کاروں کا گروہ ہے غصہ سے فرمایا گیا۔

میں نے اگلے سوال کو ذہن کے قبرستان میں دفن کرتے ہوئے اپنے اردگرد دور تک نظر ڈالی۔ ’’میں اپنی پسندیدہ شاعرات اور تخلیق کاروں کو دیکھ سکونگی‘۔ یہ خیال بڑا ہی خوشکن تھا۔

ارے یہ کیا ایک طرف لوہے کی متعدد کرسیاں تھیں۔ ایک کرسی پر نہایت تندرست اور تنومند صاحبہ بیٹھی تھیں اور ان کو غالباً بجلی کے شوک دیے جارہے تھے۔ چہرے پر اذیت کے آثار صاف دیکھے جاسکتے تھے۔ آخر یہ قصہ کیا ہے؟ ان کے ہاتھ میں ایک لمبا قلم تھا جو پہلی نظر میں کسی حقے کا نیچہ نظر آتا تھا۔ قلم کی لمبائی پر مکمل حیرت زدہ بھی نہ ہو پائی تھی کہ اس کے نچلے حصے سے اس طرح چنگاریاں نکلنا شروع ہوئیں جیسے ویلڈنگ کرتے ہوئے نکلتی ہیں۔

’’فرشتے بھائی ان بیچاری کو بجلی کے شاک کیوں دیے جارہے ہیں‘‘ میں نے انکی سمت ہاتھ اٹھا کر نزدیک سے گزرتے فرشتے سے معلوم کیا۔ شکر ہے انہوں نے جواب دیدیا۔

’’یہ ایک مشہور مصنفہ ہیں نوجوان طبقے کی اصلاح کے نام پر انہوں نے فحش نگاری کو اپنا شعار بنایا انکے ناول اور افسانے جذبات سفلہ ابھارنے کے سوا کوئی تعمیری کام نہ کر سکے۔ اور سب سے بڑی بات بعدِ موت اسلامی روایات کو پائمال کرنے کو انفرادیت کا نام دیا اور اپنے لیے بجلی کی کرسی منتخب کی۔‘‘ ’’یہ کب تک اس عذاب میں مبتلا رہیں گی‘‘۔ میں نے کہا۔

روزحشر تک پھر خدا تعالیٰ جسے چاہے بخش دے۔

چند سر پھروں نے اسلامی روایت کی اس بغاوت کو انفرادیت کا نام دیا۔

میں نے فرشتے بھائی کا شکریہ ادا کر کے دوسری طرف نظر کی ایک ویسی ہی کرسی پر ایک حسینہ بیٹھی نظر آئیں یہ بھی غالباً فواحشات لکھنے کے عذاب میں مبتلا تھیں۔ اس کے بعد جس کرسی پر نگاہ گئی وہاں ایک حسین اور نوجوان شاعرہ تھیں۔ آخر انکا جرم کیا ہے؟ کہانی کار پر تو فحش نگاری سمجھ میں آتی ہے لیکن ہزلیات تو خاص مردوں کا حصہ ہے۔ میں نے آج تک کسی بیچاری شاعرہ کے بارے میں نہیں سنا کہ اس نے ہزلیات کہیں ہوں۔ یہ کس عذاب میں پکڑی گئیں۔

انہیں سوچوں میں غلطاں تھی کہ قریب سے بات چیت کی آواز آئی۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا ایک بھاری بھرکم خاتون فرشتے سے غالباً انہیں شاعرہ کے متعلق استفسار کر رہی تھیں جو میری ذہن میں ہلچل مچائے ہوئے تھا بے صبری سے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ ’’اس کا

جرم ہے بے حیائی، بے پردگی مختصر کپڑوں اور بے تحاشا میک اپ زدہ ہو کر یہ شاعروں میں جاتی رہی ہے۔ یہ ڈائس پر غزل سنانے نہیں اپنے حسن کی داد لینے آتی تھی۔ سامعین کانوں سے نہیں آنکھوں سے کام لیتے۔ سامعین کے اصرار پر اسے متعدد بار ڈائس سے نوازا جاتا اور بڑے بڑے ماہرین فن منھ دیکھتے رہ جاتے۔

اچانک ہی ایک طرف سے آتی ہزیانی چیخوں نے سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ کیا دیکھا ایک بڑے کڑھاؤ میں تیل پک رہا ہے ایک عورت کو دو فرشتے پکڑ کر اس تیل میں ڈال رہے ہیں۔ یہ چیخیں اسی عورت کی ہیں۔ میں نے خاموشی سے دیکھنا مناسب خیال کیا۔ ویسے بھی کڑھاؤ اور اس میں پکتا تیل دیکھ کر جسم پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ کہیں فرشتے میری بک بک سے تنگ آ کر مجھے ہی اس میں نہ ڈال دیں یہ بہت بڑا خدشہ تھا۔

''جانتی ہو یہ کون ہے''؟ برابر سے آواز آئی۔ میں نے دیکھا وہی بھاری بھرکم خاتون مجھ سے مخاطب تھیں جو کچھ دیر پہلے فرشتے سے شاعرہ کے بارے میں استفسار کر رہی تھیں۔ 'نہیں' کہہ کر میں نے لگے ہاتھوں ان کا تعارف بھی حاصل کرنا چاہا کہ نہ جانے کیوں وہ بہت اپنی اپنی سی لگیں۔

''میں وہی ہوں جس کی تم زندگی میں فین تھیں''۔ ان کا جواب تھا۔ میں مسرت سے جھوم اُٹھی یہ بھی بھول گئی کہ میں مر چکی ہوں اور زندہ ایکٹی ویٹز کی یہاں گنجائش ہی نہیں ہے۔ اب چیخوں کی آواز تیز سے تیز تر ہونے لگی غالباً فرشتوں نے اسے پکڑ کر تیل میں ڈال دیا تھا اد یہ سے تعارف کے چکر میں میرا سوال کہیں گم ہو گیا تھا۔ مجبوراً میں نے دوبارہ معلوم کیا یہ تسلیمہ نسرین ہے نام کی حد تک مسلمان جس نے اسلام جیسے پاکیزہ مذہب کی اہانت کو اپنی کتاب کا موضوع بنا کر سستی شہرت بٹوری۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ کڑھاؤ کے پکتے ہوئے تیل میں غرقابی کے بعد بھی وہ زندہ تھی۔ ذہن میں سوال نے سر اٹھایا تھا کہ پاس سے گزرتے فرشتے بھائی نے میری سوچ پڑھ لی۔ (شاید یہاں ایسا ہی ہوتا ہے)۔ اور کہا ''یہاں موت کا لفظ بے معنی ہے موت صرف دنیا کے لیے ہے یہاں روز حشر تک یہی کیفیت باقی رہے گی''۔

میرے ٹھیک پیچھے ایک چوڑی دیوار تھی جہاں سے عجیب سا شور سنائی دے رہا تھا۔ میں

نے لگے ہاتھوں یہ بھی معلوم کرلیا کہ پسِ دیوار کیا ہے؟

''اُدھر مرد حضرات ہیں''۔ میں نے اچک کر دیکھنا چاہا فرشتے کے ہاتھ میں لوہے کا ایک برچھا تھا اس نے جیسے ہی میرے سر پر رسید کرنا چاہا دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر میں جلدی سے نیچے بیٹھ گئی۔ ورنہ دماغ پاش پاش ہو جاتا۔ میں نے بیٹھے ہی بیٹھے فرشتے کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ''پیارے فرشتے بھائی میں گذشتہ صدیوں کے ان صوفی شاعروں اور ادیبوں کو دیکھنا چاہتی ہوں جن کو شروع سے پڑھتی رہی ہوں''۔

فرشتے نے کچھ دیر سوچا اور سوالیہ نگاہوں سے دوسرے طرف دیکھا اس نے سر سے اشارہ کیا۔ پہلے فرشتے نے ایک ٹوپی میری طرف بڑھائی'' لے اس کو اوڑھ لیے اب تو ادھر کسی کو نظر نہیں آئے گی''۔

میں گھبراہٹ میں شکریہ ادا کرنا بھی بھول گئی۔ ٹوپی پہن کر دیوار کی دوسری سمت دیکھا۔ یہاں بڑا عجیب نظارہ تھا۔ صف در صف لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک خاص چیز جو مستورات میں مفقود تھی یہ تھی کہ ہر ایک کے شانے سے ایک کارڈ منسلک تھا۔ جس پر نام، تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج تھا۔ میں نے ایک بزرگ ترین ہستی کے کارڈ پر نگاہ کی یہ شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ دائیں طرف جلال الدین رومی المتخلص مولانا روم تھے۔ بائیں طرف حضرت امیر خسرو بیٹھے تھے۔ واہ مالک تیرا شکر احسان ہے جن کو ہستیوں کو زندگی میں دیکھنے کی آرزو تھی وہ بعد از مرگ تو نے پوری فرمادی۔ کاش کچھ پہلے یہاں آجاتی۔ امیر خسرو کو دیکھ کر بے اختیار ان کا ایک شعر ذہن میں گونجنے لگا۔

روزِ محشر ہر کسے در دست گیر د نامہ

من نیز حاضری شوم رتصویرِ جاناں در بغل

نوعمری کا پڑھا ہوا شعر تھا سمجھ میں صرف یہی آیا کہ ہر کوئی نامہ اعمال کے ساتھ جائے گا لیکن خسرو غالباً محبوب کا کوئی فوٹو ساتھ لے جائینگے عشق حقیقی اور مجازی میں تمیز کرنے کی عمر ہی نہیں تھی۔ میں نے جلدی سے ان کے دائیں شانے پر نظر کی جہاں سے نورانی شعائیں نکل کر فضا میں بکھر رہی تھیں''اوہ تو تصویر کا مطلب تصویر خدا تھا۔''

شاعروں اور ادیبوں سے ہوتی ہوئی میری نگاہ میدان کے ایک حصے کی طرف گئی۔ ایک بڑی سی دیگ رکھی تھی اتنی بڑی دیگ میں نے اجمیر شریف کی درگاہ کے علاوہ کہیں نہیں دیکھی تھی دو فرشتے ایک شخص کو پکڑ کر دیگ کے اندر ڈال رہے ہیں میری نظر اسکے کارڈ پر گئی۔ The stanic vr' s۔شیطانی آیات کا مصنف۔

اوہ تو یہ بد بخت سلمان رشدی ہے۔ جس نے مذہب اسلام کے ساتھ ساتھ ہمارے آقائے نامدار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے کی ہمت کی۔ اس کا حشر ٹھیک ہی ہو رہا ہے۔ سب سے عجیب چیز ایک عجیب وغریب جھولا تھا۔ جس میں بڑی بڑی کرسیاں فٹ تھیں اور کرسیوں میں کیلیں نصب تھیں۔ جھولے کے اوپر جلی حرفوں میں۔ ''بدنصیب نیتا'' لکھا تھا۔ ہر کرسی پر ایک نیتا فٹ تھا۔ یہ اس قدر تیزی سے چکر کاٹ رہا تھا کہ نظر ٹھہرنا مشکل تھا۔ چیخ پکار کی آوازیں تھیں غالباً قریب کھڑے فرشتوں سے نیتا رحم کی بھیک مانگ رہے تھے۔

''بڑا شوق تھا تمھیں کرسی پر بیٹھنے کا اب یہ واویلا کیوں۔ اسی کرسی کے لیے تم اللہ تعالیٰ کے سیدھے سادے بندوں سے دغا فریب کرتے تھے۔ دو قوموں کو آپس میں لڑاتے تھے آج تک جتنے فرقہ دارانہ Comunal Riots ہوئے ان میں تمھاری شمولیت ضروری رہی۔ کتنے گھر جل گئے بچے یتیم ہوگئے۔ ملک کی سڑکوں پر خون بہا کر تم کرسی کے حقدار بنتے تھے اب بھگتو'' ایک فرشتے نے نفرت آمیز لہجہ میں کہا۔

''ہم ہاتھ جوڑتے ہیں اللہ پاک کے دربار میں ہماری توبہ پہنچا دو''۔ ایک نے ہمت کر کے کہا'' خاموش بے ادب در توبہ بند ہو چکا تمھیں روز حشر تک اسی طرح جھولے میں بیٹھنا ہے''۔ فرشتے نے کڑک کر کہا۔

جھولے کو دیکھ کر مجھے چکر سا آنے لگا لہٰذا دوسری طرف دیکھنے لگی۔

یہ کیا؟ ایک نورانی باریش بزرگ چند رسائل ہاتھ میں لیے تھے۔ میں نے ان کو دیکھا تھا۔ قریب ہی ایک میز کے برابر ایک اور صاحب بیٹھے تھے۔ ان کے آگے بھی کچھ کاغذات پھیلے ہوئے تھے۔ بغیر کسی کے بتائے میری سمجھ میں آ گیا یہ بزرگ زندگی بھر اسلام کی اشاعت میں کوشاں رہے دعوت اور تبلیغ کا کام کرتے رہے۔ سیکڑوں مسلمانوں کو سچا مومن بنا دیا اور دوسرے

صاحب نے نشر و اشاعت میں ان کے شانے بشانے کام کیا۔ دنیا سے گزرنے کے بعد بھی ان کا اشاعتی ادارہ قائم، دائم ہے۔

جس میں زیادہ تر ہاتھ ان کے مدیر اعزازی کا ہے............... بھائی میں آواز دینے ہی والی تھی کہ میرے شانے پر ایک ضرب پڑی "بس بہت دیکھ لیا ٹوپی اتار"۔

"فرشتے بھائی" میں نے لجاجت سے کہا۔

"بول تیری بک بک نے تنگ کر دیا ہے۔ اب کیا معلوم کرنا چاہتی ہے"۔

"ابھی میں نے دو نیک انسانوں کے پاس چند کاغذات دیکھے ہیں جب انسان دنیا سے خالی ہاتھ آتا ہے بجز نامہ اعمال کے پھر یہ کاغذات کیسے تھے۔

"سُن اللہ کی نادان بندی یہ سچ ہے انسان دنیا سے خالی ہاتھ آتا ہے۔ لیکن ان رسائل میں تفسیریں ہیں، فقہ کے مسائل ہیں۔ حدیثِ نبوی اور دعوت حق ہے، اسلامی ڈھنگ سے زندگی گذارنے کے طریقے ہیں۔ تبلیغ ہے سیکڑوں بندگانِ خدا اس سے فیض یاب ہو چکے ہیں یہ زندگی بھر اسلام کی اشاعت کے لیے کوشاں رہے ان کے بعد ان کے ورثا اسی راہ پر چل رہے ہیں یہ ہمیشہ باقی رہنے والی نیکی ہے"۔

"بس ایک آخری التجا"۔ میں نے دست بستہ عرض کیا۔

"بک جلدی سے لیکن بس آخری ہونا چاہیے۔

"آپ تو برابر عالم بالا سے عالم آب و گل میں سفر کرتے رہتے ہیں میری ادھوری تخلیقات اور ایک قلم لا دیں تو زندگی بھر۔ نہیں نہیں میں بھول گئی تھی کہ زندہ نہیں ہوں خیر روز حشر تک احسان مند رہونگی فرشتے کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوگئی۔

"اری بد بخت یہاں کا حالِ زار دیکھ کر تجھے عبرت حاصل نہیں ہوئی مرغ کی ایک ٹانگ پکڑے ہوئے ہے۔ مر کر بھی لکھنے کا بھوت تیرے سر پر سوار ہے۔ طرح طرح کے عذاب دیکھ کر بھی تیری آنکھیں نہیں کھلیں۔ تجھے معلوم تو یہ کرنا تھا کہ تیرے لیے کون سا عذاب مقرر ہوا ہے"۔

"مجھے، مجھے، عذاب، عذاب۔ میری زبان لڑکھڑانے لگی۔ اب تک دوسروں کی واویلا سُن رہی تھی اپنے انجام سے بے خبر۔

''فرشتے بھائی میں نے اپنے ہوش میں پنج وقتہ نمازیں پڑھی ہیں رمضان شریف کے روزے بھی رکھے ہیں حسب حیثیت صدقہ خیرات بھی کیا ہے کوئی گناہ کبیرہ بھی یاد نہیں''۔

''کن نمازوں کا ذکر کر رہی ہے۔ نماز تقرب الٰہی کا ذریعہ جب ہی بنتی ہے جب باقی دنیا سے رابطہ کاٹ کر صرف صرف تصور خدا کر کے اس کے سامنے سر جھکایا جائے دل میں دنیا کی کسی بات کا گزر تک نہ ہو۔ جہاں پیشانی کے ساتھ ساتھ دل بھی جھک جائے۔ ایک بندۂ خدا نے کہا ہے۔

تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور
ایسے امام سے گزر ایسی نماز بے گزر

تو نے نمازیں اس لیے پڑھیں کہ دنیا تجھے دیندار سمجھے نماز میں تیری توجہ پلاٹ اخذ کرنے کسی نئی کہانی کا تانا بانا بننے اور کرداروں کے ڈائلاگ میں ہوتی تھی۔ تیری نمازیں صرف دکھاوا تھیں۔ تیری نظر عقبیٰ سے زیادہ دنیا پر تھی تبھی تو یہاں بھی بک بک لگا رکھی ہے میرے بیٹے، پوتے گھر اور اس کی زیبائش، تو روز قرآن پڑھتی ضرور تھی قرآن پاک کی یہ آیت تجھے کبھی نظر نہیں آئی ''اَلْمالُ والبنونَ زینت الحیات الدُنیا'' (سورہ کہف) میں سرتاپا کانپ کر رہ گئی فرشتے کا انداز طنزیہ تھا۔

''جانتی ہے تجھے مرے ہوئے کتنے دن ہو گئے''۔ میں نے نہیں میں سر ہلایا کیوں کہ یہاں نہ کوئی کلنڈر تھا نہ کلاک نہ سورج جس کے اتار چڑھاؤ سے وقت کا اندازہ ہوتا نہ چاند جس سے رات کے پہر معلوم ہوتے۔ لگتا تھا ابھی کچھ دیر پہلے یہاں وارد ہوئی ہوں۔ ویسے میری ناقص عقل میں فرشتے بھائی کا یہ سوال قطعی نہیں سمایا۔

''اپنا گھر دیکھنا چاہتی ہے''۔ فرشتے نے کہا۔

ہاں، ہاں ضرور گھر کا نام آتے ہی مجھے اپنے بیٹے بہوئیں بیٹی اور ان کی اولادیں شدت سے یاد آنے لگے۔

ہائے میرے مرنے پر انکا غم سے برا حال ہو گا چاہنے والے بیٹے سعادت مند بہوئیں بیٹیاں بری طرح سوگوار ہونگے۔ فرشتے نے ایک چھوٹا سا آلہ جس کو میں پہلے تو موبائل سمجھی لیکن

غور کرنے پر پتہ چلا کہ شاید یہ دوربین ٹائپ کی کوئی چیز ہے فرشتے نے ہاتھ بڑھا کر وہ عجیب موبائل یا دوربین یا جو بھی آفت تھی میری آنکھوں سے لگادی میرے گھر میں فرش بچھا ہوا تھا جس پر چند خواتین بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ میری نظریں اپنے جگر کے ٹکڑوں اور بیٹیاں جیسی بہوؤں کو دیکھنے کو بیقرار تھیں صحن کے ایک طرف دیگوں میں شاید بریانی دم ہو رہی تھی۔ اوہ تو آج سوئم ہے یعنی مجھے دنیا سے گزرے تیسرا دن۔

اچانک ایک طرف سے میرا بیٹا ایک بڑا سا تھیلہ لیے ہانپتا ہوا آیا ۔ دونوں بہوئیں بھی آتی ہوئی نظر آئیں۔ ''کتنے ہیں'' ایک نے دریافت کیا۔ ''ساڑھے بارہ سیر''۔ جواب آیا۔ تبھی میری ایک رشتہ دار بول پڑیں تمھاری ساس نے چنوں کو سختی سے منع کر دیا تھا۔ پھر کیوں منگوائے۔ ''اے ہے خالہ انکی کچھ مت کہوانہیں ہر چیز بدعت لگتی تھی۔ وہ تو یہ بھی تسلیم نہیں کرتی تھیں کہ فاتحہ درود کا ثواب مردے کو پہنچتا ہے بس ایک ہی رٹ تھی صرف اپنے اعمال بخشواتے ہیں ہمیں تو آخر دنیا کو منہ دکھانا ہے چھوٹی بہو نے کہا۔ ''خیر خیر تمہاری ساس اچھی انسان تھیں''۔

''بس خالہ آگے کچھ مت کہیں ساسیں بھی کہیں اچھی ہوئی ہیں۔ بڑی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ ''اے دلھن چوڑیاں مل گئیں''۔ میری رشتہ کی ایک بہن نے کہا۔

''گم کب ہوئیں وہ تو مرتے ہی شاید بیٹی نے اتار لیں''۔ بہو نے غصہ سے سرخ ہوتے ہوئے کہا'' اور غسل کے وقت جو کانوں کے ٹاپس تھے۔ وہ شاید فرحانہ نے لے لیے'' بڑی نے چھوٹی کی طرف اشارہ کیا۔

کیوں تہمت لگا رہی ہو۔ میں تو اس وقت سپارہ پڑھ رہی تھی۔ تم ہی چکر میں تھیں۔

''خیر چھوڑو ان باتوں کو کھانا تیار ہو جائے تو محتاجوں اور فقیروں میں تقسیم کر دینا''۔

''اے نوج چھوٹی بہو کی ماں نے کہا۔ اتنا تھوڑی پکوایا ہے کہ مسٹنڈے فقیروں کو کھلائیں۔ خیر سے تین تین چار چار سمدھیانے ہیں۔ آخر عزت بھی تو کوئی چیز ہے۔

میں نے دوسری طرف نظر کی میرے بیٹے گھر کے بٹوارے کی بات چیت کر رہے تھے۔ میں اس دوربین کو تھوڑا سا موڑ کر دیکھا میرا کمرہ سامنے تھا۔ لیکن یہ کیا سارے کاغذات اور نفیس کتابیں اپنی جگہ سے غائب تھیں۔

آخر کہاں گئیں؟ میری مشکل جلد ہی ایک آواز نے آسان کردی میرے بیٹے نے کسی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''کمرہ چھوٹا ہے جگہ کم اور کباڑ زیادہ لہٰذا ہم لوگوں نے والدہ مرحومہ کے تمام کاغذات نکو کی پرچونی کی دُکان پر دیدئے۔ میں نے دوربین کو دور پھینکا۔ دنیا اور دنیا والوں پر لعنت بھیجی کیا یہی گھر یہ اولاد واملاک یہ دنیا اسی پر مجھے ناز تھا۔ موت کے نام پر موت پڑنے لگتی تھی تو یہ تھی اس کی حقیقت مجھے یہ جگہ حسین سے حسین تر نظر آنے لگی۔ اور موت ایک حسین دلکش پری اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی اور نیچے گر گئی۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا میں پسینہ سے تر اپنے بستر پر دراز۔ پانی میرے حلق سے آواز نکلی بیٹی نے جلدی سے اٹھ کر پانی پلایا۔ ''امی آپ نے چیخ ماری اسی سے میں جاگ گئی کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا''۔ میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چند ہی پلوں میں اللہ اکبر کی پرسوز آواز فضا میں گونج اٹھی۔ میں نے اٹھ کر وضو کیا اور شاید پہلی بار خشوع و خضوع سے نماز فجر ادا کی۔ دیر تک گناہوں سے معافی مانگتی رہی کہ در توبہ ابھی بند نہیں ہوا ہے۔ خدا ہر مسلمان کو سچے دل سے توبہ کی توفیق اور عبادت خداوندی کی توفیق عطا فرمائے۔

ستم نصیب کے

تیز تیز چلنے سے وہ پسینہ میں شرابور تھی دور دور تک سڑک ویران اور سنسان تھی۔ اکا دکا لوگ آجا رہے تھے۔ ''آج پہیہ روک'' ہڑتال تھی۔ کسی سواری کے ملنے کا دور دور امکان نہیں تھا۔ خدا خدا کر کے راستہ تمام ہوا۔ وہ گھر میں داخل ہوئی بے تابی سے چاروں طرف نگاہ کی اور بچی کے بستر کے قریب آ گئی۔ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار کا اندازہ لگایا۔ تپش سے ماتھا مانو انگارہ بنا ہوا تھا ۔ پھول سے رخسار تمتما رہے تھے۔ ماں کے ممتا بھرے ہاتھوں کے لمس نے اسے چانکا دیا۔

''امی آپ آ گئیں'' کہہ کر اس نے اپنی معصوم باہیں ماں کی گردن میں حمائل کر دیں۔

''ہاں میری چاند میں آ گئی'' کہتے ہوئے عالیہ اس کے بستر پر بیٹھ گئی بچی کا سر اپنی گود میں رکھ کر اس کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ دوا کا پیکٹ قریب پڑی میز پر رکھ دیا۔ ممتا کی گود میں معصومیت محو خواب ہو گئی۔ عالیہ نے آہستہ سے بچی کو اپنے سے الگ کر کے بستر پر لٹا دیا۔ بجھتے ہوئے لیمپ کی مدھم لو کو اونچا کیا۔ لیکن وہ کسی قریب المرگ مریض کی طرح سسکیاں لینے لگا۔ شاید تیل ختم ہو گیا۔ لائٹ تو بل جمع ہونے پر ہفتہ بھر پہلے ہی کٹ چکی تھی۔

وہ بے چینی سے ندیم کا انتظار کر رہی تھی۔ ندیم اسکا اکلوتا انیس سالہ بیٹا جس کو وقت نے کسی کالج کا کھنڈرا طالب علم بننے کے بجائے ایک فرم کا مزدور بنا دیا۔

ندیم اور ثوبیہ اس کی اجاڑ بے مایہ زندگی کے دو سہارے بیوگی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چمکنے والے دو روشن ستارے۔ وہ اپنے بچوں کو دیوانہ وار چاہتی ندیم کی تسلیاں، دلاسے اور ثوبیہ کی بھولی بھالی باتیں اس کی آنکھوں میں اَن گنت دیپ روشن کر دیتیں۔ ادھر کئی دنوں سے ثوبیہ کو بخار ہے۔

ادھر نکڑ والے ڈاکٹر صاحب جو غالباً کسی ڈگری یافتہ ڈاکٹر کے یہاں کمپاؤنڈری کرتے کرتے ڈاکٹر بن بیٹھے اور عالیہ جیسے غریبوں پر اپنا ہنر آزما رہے ہیں۔ انکے ایک ہفتہ کی دواؤں سے بخار ٹوٹنے میں نہیں آتا۔

آہٹ پر چونک کر اُسنے سر اُٹھایا لاڈلا بیٹا تھکا ماندہ گھر میں داخل ہو رہا تھا'' آ گئے بیٹا آج بہت دیر ہوگئی'' عالیہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''امّی فرم میں کام بہت زیادہ ہے جب سے سیٹھ جی نے سبھاش کو الگ کیا ہے اس کا کام بھی مجھے دیکھنا پڑتا ہے''۔ ماں بیٹے ابھی باتیں کر ہی رہے تھے لیمپ بھڑک کے خاموش ہو گیا۔اندھیرے میں عالیہ کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔

''امّی سامنے کی کھڑکی کھول دوں ہاشم صاحب کے گیٹ پر جلتے بلب کی روشنی اندر آجائے گی''۔اُف غربت، مجبوری ایک خوددار ماں کا بیٹا مانگے کے اجالے سے اندھیرا دور کرنا چاہتا تھا۔عالیہ نے کھانا گرم کیا ٹرے بیٹے کے آگے رکھ دی۔

''امّی ثوبیہ کا بخار کم ہوا؟'' ندیم نے کھانا کھاتے ہوئے دریافت کیا۔

''نہیں بیٹا بدن تو تو ا ہو رہا ہے کمزوری بھی کچھ زیادہ ہی ہوگئی ہے''۔''سوچتی ہوں ڈاکٹر خان کو دکھا دوں'' عالیہ نے ٹوٹے ہوئے لہجہ میں کہا''۔

ڈاکٹر خان! اس شہر کے بڑے ڈاکٹر جن کی معائنہ فیس ہماری سوچ سے زیادہ ہے چیک اپ اور دوائیں الگ۔''ہم غریبوں کے لیے نکّو کی دوکان والے ڈاکٹر ہی ٹھیک ٹھاک ہیں ہم جیسوں سے ان کی روزی روٹی چل رہی ہے''۔ندیم کا لہجہ زہریلا تھا۔

''بیٹا میں نے سنا ہے تمھاری فرم کے سیٹھ جی بھی غریبوں کے بڑے ہمدرد ہیں بلکہ یہاں تک معلوم ہوا ہے کہ امریکہ سے غریبوں کے لیے امداد منگوا کر تقسیم کرتے ہیں'' عالیہ نے کہا۔

''بالکل ٹھیک سنا آپ نے کھانا پکوا کر غریبوں فقیروں کے بچوں کو کھلاتے ہیں اور ان کے فوٹو گراف لیکر روانہ فرما دیتے ہیں تاکہ پتہ چلے کہ یہاں کی غریبی ان کے ایک وقت کے کھانے نے دور کرادی۔ ڈالروں سے وہ اپنا کاروبار چمکاتے ہیں'' ندیم کا لہجہ زیر زیر تھا۔''اچھا عالیہ کے لہجہ میں استعجاب تھا''۔

''سرمایہ دار صرف اور صرف سرمایہ دار ہوتا ہے۔ دولت کے انبار کے نیچے ہر احساس دفن ہو جاتا ہے''۔ندیم نے مزید زہر اگلا''۔

''بیٹا ہر کوئی ایک جیسا نہیں ہوتا''۔عالیہ کا لہجہ دفاعی تھا۔

"کیوں نہیں ہوتا آخر ہمارے سگے چچا کے پاس کس چیز کی کمی ہے، کیا مدد کی انہو ں نے ہماری ہم کرائے کے ایک کمرے کے ڈربے میں زندگی گزار رہے ہیں اور وہ شاندار دو منزلہ مکان میں پُرتعیش زندگی کا لطف لے رہے ہیں۔ سب ایک جیسے ہوتے ہیں دوسروں کی مجبوریاں خریدنے والے"۔

ندیم کا تلخ لیکچر عالیہ نے خاموشی سے سُنا اور آنکھیں بند کرلیں۔

صبح اس نے بکس سے وہ روپیہ نکالے جو پیٹ کاٹ کر بجلی کے بل کے واسطے رکھے تھے۔

"ثوبیہ" کمپاؤنڈر نے پکارا بچی کو لیکر ڈاکٹر خان کے چیمبر میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر نے توجہ سے بچی کو دیکھا بی بی یہ معمولی بخار نہیں ہے گلے میں گانٹھ بھی ہے یہ T.B کی طرف اشارہ ہے۔ علاج لمبا ہے لیکن اگر باقاعدگی سے ہوا تو انشاءاللہ ٹھیک ہو جائے گی"۔ پیشہ وارانہ ہمدردی سے کہا۔

عالیہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈاکٹر کو دیکھ کر رہ گئی۔ رٹی تسلی دے کر ڈاکٹر نے اس کو رخصت کیا کہ اگلے مریض کی باری تھی۔ باقی بچے پیسوں سے دوائیاں خرید کر گرتی پڑتی لڑکھڑاتی کسی طرح گھر پہنچی۔ تھکن سے نڈھال بچی غافل ہوگئی عالیہ بھی اس کے قریب ہی لیٹ گئی۔ آنکھیں بند ہوتے ہی ذہن کے اسکرین پر ماضی کی وہ فلم چلنے لگی جس میں تلخیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

ماضی کی اولین تلخی سوتیلی ماں تھی۔ عورت کو رحم و ہمدردی کی موت کہا جاتا ہے اس کی دھڑکنوں میں گذار ہوتا ہے۔ اس کی دنیا میں آمد پر رحمتِ خداوندی جوش میں آجاتی ہے۔ یہاں تک کہ اسکے پیروں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔ لیکن یہی الوہی گداز رکھنے والی عورت جب ظالم ساس اور سوتیلی ماں کا روپ دھارتی ہے تو ہلاکو اور چنگیز خاں کی روح بھی تڑپ اٹھتی ہے۔ کہیں بچوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں کہیں بھولی بھالی ریشمیں بہوئیں جلا دی جاتی ہیں۔ ایک تصویر کے بعد دوسری تصویر متحرک تھی۔

آفاق اس کا منگیتر مردانہ وجاہت کا پیکر جو اس کی روح میں اترا ہوا تھا۔ مسکراتے شب و روز جن کا وقفہ بہت کم تھا۔

''یہ شادی نہیں ہو سکتی آفاق ابھی کالج کی چار دیواری میں ہے۔ تعلیم ختم ہونے میں اچھا خاصا وقفہ ہے اس کے بعد ملازمت کی تلاش، عالیہ کی عمر بڑھتی جا رہی ہے۔ لوگوں کی انگلیاں اُٹھ رہی ہیں''۔ ابا جی کے الفاظ اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر گئے۔

اس میں بڑا ہاتھ اس عورت کا تھا جس کو قدرت نے سوتیلی ماں کا روپ دیا تھا۔ اس نے شاید آفاق کے نام پر عالیہ کے چہرے پر پھوٹتی شفق دیکھ لی تھی۔

وہ روئی، چلائی، تڑپی پھر ایک روایتی مشرقی لڑکی کی طرح خاندانی لاج کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دی گئی۔ اس کی ناکام حسرتوں کا جنازہ اوباش ناصر کے کاندھوں پر لاد دیا گیا۔ جو اس کی سوتیلی ماں کا بگڑا ہوا بھتیجہ تھا۔ ایک ناکام عورت نے کامیاب بیوی بننے کی پوری کوشش کی۔ شوہر کو راہِ راست پر لانے میں اس نے اپنا تن من وار دیا۔ لیکن بے سود ناصر کو دن بدن عالیہ سے چڑ ہوتی گئی۔ مار پیٹ گالی گلوچ اس کا مقدر بن گئی۔ اب وہ ایک پھول سے بچے کی ماں بن گئی تھی۔ وقت کا پہیہ تیزی سے گردش کرتا رہا۔ عالیہ کا وجود بکھرتا گیا۔ وہ ایک چلتی پھرتی لاش میں تبدیل ہو چکی تھی جینے کا اگر کوئی جواز تھا تو صرف ننھا ندیم۔

قدرت انسان کو اسکی بداعمالیوں کی سزا ضرور دیتی ہے یہی اس کا انصاف ہے۔ ناصر اندر ہی اندر کھوکھلا ہو چکا تھا۔ شراب نوشی کی کثرت نے اس کے دونوں پھیپھڑوں کو ناکارہ کر دیا تھا۔

ثوبیہ کی پیدائش سے ٹھیک ایک ہفتہ بعد ناصر نے اس دنیا سے منہ موڑ لیا۔ اس کی موت کے بعد پتہ چلا کہ جیب یہاں تک کہ رہائشی مکان بھی جوئے، شراب اور دیگر بداعمالیوں کی نظر ہو چکا ہے۔ ایک ہفتہ بعد عالیہ سے مکان خالی کرالیا گیا۔ میکہ کا دروازہ باپ کی موت سے بند ہو چکا تھا۔ سوتیلی ماں اور بھائی ایک سیکنڈ کے لیے بھی اس کو اور اس کے بچوں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

وقت اور حالات کے بے رحم تھپیڑے تھے اور کمزور عالیہ بادِ مخالف کے جھونکوں میں وہ ایک تنکے کی طرح اڑتی رہی بے یار و مددگار اپنوں کی ٹھکرائی، حالات کی ستائی ہوئی۔ وقت کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ روندتا پائمال کرتا بہر حال گذر جاتا ہے۔ عالیہ کے سر میں بڑھاپے سے پہلے چاندی کے تار چمکنے لگے۔ بچے بڑے ہوتے گئے اور وہ کمزور اور نڈھال اب ثوبیہ دس سال کی ہو چکی تھی۔

اچانک وہ چونک کر ماضی کی رہگزر سے حال میں لوٹ آئی۔ ''اُف میں اتنا روپیہ کہاں سے لاؤں؟ میری بچی میری آنکھوں کے سامنے موت کی بھیانک جبڑے میں چلی جائے گی نہیں نہیں پروردگار میری برداشت کا امتحان مت لے۔ میرے مالک مجھے اٹھا لے مجھے اپنے پاس بلا لے''۔

عالیہ کے الفاظ شاید پہلی بار گاہ الٰہی میں شرف باریابی پا گئے۔ صبح ثوبیہ جھنجھوڑ کر ماں کو اٹھا رہی تھی۔ امّی اُٹھیے، امّی اُٹھیے بھائی دیکھو آج امّی اٹھ کر نہیں دے رہی ہیں۔ معصوم کو کیا معلوم وہ سارے دکھوں سے نجات پا کر ابدی بند سو رہی تھی قیامت تک نہ ٹوٹنے والی نیند۔

وارث

جوں جوں ہندوستان نزدیک آتا جا رہا تھا میری دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی جا رہی تھیں۔ جہاز نے لینڈ کیا کسٹم کی ضروری کاروائیوں سے نبٹ کر باہر آئی۔ تیس سال بعد میں نے اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھا جہاں میں پیدا ہوئی بڑھی پلی آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے جوان ہوئی۔ جس کی خاک کے نیچے میرے بزرگ آرام فرما ہیں۔ مجھے رسیو کرنے والا کوئی نہ تھا لیکن لگا یہاں کی فضائیں اور دھیرے دھیرے چلنے والی ہوائیں مجھے خوش آمدید کہہ رہی ہوں۔ وطن عزیز کے دو ٹکڑے ضرور ہو گئے آبادی کو بانٹ دیا گیا لیکن احساسات اور جذبات کی تقسیم نہ ہو سکی۔ وطن کو چھوڑ کر جن لوگوں نے ہجرت کی وہ آزادی کے باسٹھ سال بعد بھی اپنی شناخت نہیں بنا پائے مہاجر ہی کہلائے۔ مقامی لوگوں نے ان سے دوری برقرار رکھی جس کے شاہد پاکستان میں آئے دن ہونے والے پرتشدد واقعات ہیں۔

میں اپنی احساسات میں گھری باہر آئی۔ ہر طرف اجنبی چہرے تھے۔

''ماما کس طرف چلنا ہے'' میرے بیٹے نے ٹیکسیوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''موتی محل شاہ مینار روڈ''۔ پتہ سمجھا کر میں اس کے ساتھ ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

''قدیم عمارات کی جگہ کئی کئی منزلی کوٹھیاں اور فلیٹ بن گئے تھے۔ عالی شان ہوٹل، میرج ہوم ابھی تک کوئی عمارت ایسی نظر نہیں آئی جس سے میری آنکھیں آشنا ہوں۔ راستہ طویل تھا میں ماضی میں ڈوبنے لگی۔ عظیم اللہ خاں کی حویلی اپنی وسعت اور خوبصورتی کے لیے دور دور مشہور تھی۔ بیشمار کمرے اونچی کرسی کے لق ودق برآمدے سہہ دریاں۔ وسیع لان میں پھل دار درخت خوشنما پودے خوبصورت پھولوں سے ڈھکی بیلیں سلیقہ سے تراشی ہوئی مہندی کی باڑھ۔

دادا کی دو ہی اولادیں تھیں مصطفےٰ علی خاں اور مجتبیٰ علی خاں۔ میں مصطفےٰ خاں کی اکلوتی اولاد۔ چھوٹے چچا کی زینت میرے والدین کا بچپن میں انتقال ہو چکا تھا میں چچا چچی کی سایہ عاطفت میں پلی بڑھی چچی اکثر غمگین رہتیں۔ ''ہائے دونوں ہی لڑکیاں یہ اتنی بڑی حویلی اور

زمینیں کون سنبھالے گا" وہ گڑگڑاتیں "میرے مولا ایک بیٹا دیدے حویلی کا وارث جو باپ دادا کی وراثت کی حفاظت کر سکے"۔ چچی کی دعائیں مستجاب ہوئیں۔ میں اور زینت تقریباً گیارہ بارہ سال کے رہے ہونگے تب اللہ تعالیٰ نے انکی جھولی میں حویلی کا وارث اتار دیا۔ چچا چچی کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا ہم دونوں بھی بہت خوش تھیں۔ کئی روز حویلی میں جشن کا سا سماں رہا۔ میں اور زینت ایک دوسرے سے بے پناہ پیار کرتے تھے۔ اب اس پیار میں زاہد بھی شامل ہو گیا وہ بچپن سے ہی سست اور کاہل اور پڑھائی سے جی چرانے والا تھا۔ مستزاد چچی کے لاڈ پیار نے اسے بڑی حد تک ضدی اور بے حس بنا دیا تھا۔ چچا اس کو لے کر اکثر چچی سے الجھ پڑتے۔ لیکن چچی کی نظر میں اس کا صرف لڑکا ہونا ہی سب کچھ تھا۔ اسی دوران میرے لیے ہمایوں کا رشتہ آیا جو ہر لحاظ سے بہترین تھا یوں میں ہمایوں کے ساتھ اپنوں سے ہزاروں میل دور آ گئی۔ مجھے یاد ہے زینت میری رخصتی پر کتنا روئی تھی۔ چند سال خط و کتابت رہی اس کے بعد ہم لوگ کینیڈا چلے گئے۔

گھریلو مصروفیات بچوں کی پرورش یادیں مدھم ہوتی گئیں۔ چچا اور اس کے بعد چچی کے انتقال کی خبریں ملیں تب شیراز چند روز کا تھا۔ زینت کی شادی میں بھی آنا ممکن نہ ہوا۔ غرض کوئی نہ کوئی مجبوری آڑے آتی گئی خط و کتابت کا سلسلہ قریب قریب ختم ہو گیا۔ عرصہ بعد اتنا ضرور معلوم ہوا کہ زینت بیوہ ہو گئی زاہد پہلا جیسا سست و نکما اور بیروزگار ہے۔

"لیجئے موتی نگل آ گیا اب کدھر رکنا ہے" ٹیکسی ڈرائیور کی آواز مجھے حال میں کھینچ لائی۔ میں چاروں طرف نگاہ ڈالی کہیں سے مانوسیت کی خوشبو نہیں آئی۔

"کسی سے معلوم کرو" کہہ کر میں نے باہر دیکھا قریب ہی ایک باریش بزرگ کھڑے تھے۔ "بھئی کس کا پتہ معلوم کرنا ہے"۔ وہ ٹیکسی کے قریب آئے "عظیم اللہ خاں کی حویلی کا"۔

عظیم اللہ خاں کی حویلی یا کھنڈر بزرگ نے ایک سرد آہ کھینچ کر بائیں جانب اشارہ کیا۔ ٹیکسی رک گئی میں اور شیراز باہر آ گئے۔ ہم لوگ ایک بوسیدہ عمارت کے سامنے کھڑے تھے۔ لگتا تھا کوئی ویران کھنڈر ہے جہاں آسیب ناچ رہے ہوں ٹوٹا ہوا پھاٹک زنگ آلود کنڈی ایک طرف جھول رہی تھی۔ دیواروں کو نونی لگ چکی تھی اینٹوں کے درمیاں کچھ پیڑ اگ آئے تھے جو اسکی وحشت میں اضافہ کر رہے تھے۔

شیراز نے سوالیہ نظریں میری جانب کیں۔ ''ماما یہ کیا؟'' ''انقلاب زمانہ'' میرا جواب تھا میں نے ہمت مجتمع کر کے اندر قدم رکھا۔ ہر طرف ویرانی چند سوکھے اور ٹنڈ منڈ پیڑ اپنی حالت زار پر روتے ہوئے۔ بہت سے کمروں کی دیواریں مہندم ہو گئیں تھیں۔

''ماما آپ یہاں کہاں آ گئیں یہاں اس کھنڈر میں کوئی نہیں رہتا یہ کوئی بھوت بنگلہ نظر آتا ہے آپ تو اپنے بہن بھائی سے ملنے آئی تھیں''۔ شیراز ے کہنے پر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ آنے سے پہلے معلومات ضروری تھی۔

''میں تو سمجھی تھی زاہد یہیں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہوگا اور زینت نے بھی بیوگی کے دن یہیں گزارے ہونگے''۔

''چلیئے ماما شکر ہے ٹیکسی کو روکے رکھا ورنہ یہاں تو واپسی بھی محال تھی''۔ میں مڑنا ہی چاہتی تھی کہ اندرونی کمرے سے ایک بوڑھی عورت آہستہ قدم اٹھاتے نکلی۔

''کون ہو بھائی''۔ اس نے ہاتھ کا چھجہ بنا کر بغور دیکھا۔ میں اگرچہ بھوت پریت کی قائل نہیں ہوں لیکن ایک لمحہ کو ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ ہوئی''۔ ''یہاں میرے بہن بھائی رہتے تھے میں ان سے ملنے آئی ہوں''۔ میں نے ہمت کو بروئے کار لاتے ہوئے کہا۔ ''اندر آجاؤ'' بوڑھی نے کہا۔

میں نے شیراز کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی خوف کے سائے تھے۔ میں متذبذب تھی بوڑھی کچھ اور آگے بڑھ آئی۔ مدقوق چہرہ اندر کو دھنسی آنکھیں روکھے سفید بال خوفناک انداز میں بکھرے ہوئے تھے۔

''اب بتاؤ کون ہو تم؟ اس نے استفسار کیا۔ ''کیا آپ جانتی ہیں زینت اور زاہد اب کہاں رہتے ہیں''۔ میں نے ہمت کر کے دریافت کیا ''تم انہیں کیسے جانتی ہو اور تم خود کون ہو''۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں دوبارہ سوال کیا ''اگر آپ کو ان کا پتہ معلوم ہو تو مہربانی کر کے بتا دیں'' میں نے بات کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔ مجھے دراصل یہاں سے نکلنے کی جلدی تھی۔ پہلے بتاؤ تم انہیں کیسے جانتی ہو''؟ وہ اپنی بات پر اٹل تھی۔

''جاننے کا کیا سوال وہ میرے بہن بھائی ہیں'' میں لہجہ کی جھنجلاہٹ پر قابو نہیں رکھ

سکی۔ ''بہن بھائی'' بوڑھی نے زیرلب کہا اور میرے کچھ اور قریب آ گئی غور سے میری جانب دیکھا۔تم،تم عافیہ ہو؟ آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ''ہاں میں عافیہ ہوں''۔

''عافیہ میری بہن میں ہی زنیت ہوں''۔ وہ بے تحاشا روتے ہوئے میرے گلے لگ گئی۔میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

اولا بدلی کہہ رہی ہے خود زبانِ حال سے

کوئی بچ نہیں سکتا دنیا میں میری چال سے

''زینت تمھارا یہ حال کس نے کردیا''۔ میں بے اختیار رو پڑی۔

''مت رو عافیہ میری آنکھوں کی جوت تمھیں دیکھنے ہی کے لیے ابھی تک قائم ہے میں نے پل پل یاد کیا۔ یہ تمھارا بیٹا ہے'' اس نے شیراز کو دیکھتے ہوئے اپنے میلے بوسیدہ دوپٹہ سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئی۔ جو بوسیدگی کے باوجود کسی حد تک رہنے کے قابل تھا۔میں نے حیرانی سے چاروں طرف دیکھا بان کی دو چار پائیوں کے علاوہ کوئی سامان نہیں تھا۔زینت نے میری حیرانی کو بھانپ لیا بک گیا سب کچھ بک گیا حویلی کا سامان بھی اس کی عزت ووقار بھی اس کی قدریں بھی۔ میں شیراز کو بیٹھنے کا اشارہ دے کر زینت کے پاس بیٹھ گئی۔ زینت کی داستانِ غم درد کا مرقع تھی حرف حرف خون آشام بیوہ ہو کر وہ دوبارہ باپ کی دہلیز پر آ گئی تھی۔زاہد جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا اس کی بری عادتیں بھی جوان اور پختہ ہوتی گئیں جوانی عیاشی کا تحفہ بھی لیکر آئی اسی کے صدقے میں ایک آوارہ جسم فروش عورت سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس حویلی کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔اور نکاح کا فریب دے کر اس پر قابض ہو گئی۔ زینت ایک بے حقیقت وجود تھا بھائی بیگانہ ہو چکا تھا گذر بسر کے لیے باپ کی چھوڑی ہوئی جو زرعی زمینیں تھیں سب ایک ایک کر کے بک گئیں دانے دانے سے محتاج ہو گئے۔ ''یہ حویلی کیسے بچ گئی''؟

زاہد کا ایکسیڈینٹ ہوا وہ معذور ہو کر گھر میں پڑ گیا۔اس عورت کے پاس جو اس کی عدم موجودگی میں آتے تھے اب اس کے سامنے آنے لگے اب زاہد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن اب دیر ہو چکی تھی چڑیوں نے کھیت چگ لیا تھا۔تو تو، میں میں ہوئی لوگ اکھٹے ہوئے باپ دادا کی عزت کا جنازہ نکلا نوبت طلاق پر پہنچی باقی بچی زمین حق مہر میں لیکر وہ چلی گئی۔

''اب زاہد کہاں ہے''۔ ''پڑوس کے میر صاحب ڈاکٹر کو دکھانے گئے ہیں''۔
''کیا ہوا اسے''۔ ''بہت دن سے کھانسی ہے''۔ ''علاج نہیں کرایا''۔ میں نے دریافت کیا۔
پیٹ بھرنے کا آسرا نہیں علاج تو دور کی بات ہے''میر صاحب بیچارے خیر خبر لے لیتے ہیں''۔ میر صاحب وہی جو ابا کے کارندے تھے۔''ہاں وہی''

کچھ ہی دیر میں ایک بوڑھا لنگڑاتا ہوا اندر داخل ہوا کپڑے میلے شیو بڑھی ہوئی سر کے کھچڑی بال اس طرح گویا برسوں سے تیل کنگھے سے واسطہ نہ پڑا ہو۔ پیروں میں پلاسٹک کے ٹوٹے ہوئے چپل۔اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ میں ضبط کھو چکی تھی''زاہد میرے بھائی یہ کیا حالت بنالی اس کے شانہ پر سر رکھ کر میں بے تحاشہ رو دی۔اس نے استفہامیہ نظروں نے زینت کی طرف دیکھا زینت کے عافیہ کہنے پر بے اختیار رو پڑا''افسوس تم بہن بھائیوں نے مجھے مردہ سمجھ لیا اتنا کچھ ہونے پر بھی مجھے کوئی اطلاع نہیں کی۔بہن بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور نظریں جھکالیں۔ میں جو چند روز کے لیے آئی تھی ہمایوں کو حالات سے آگاہ کر کے مزید رک گئی کہ دو قسمت کے ماروں کا بھی مستقل انتظام کرنا تھا۔

میں تو تھی ہی اکلوتی لیکن کاش زینت بھی اکیلی ہوتی چچی نے وارث کی آرزو نہ کی ہوتی۔ باپ دادا کا بھرم بھی باقی رہتا اور عزت وقار کی دھجیاں نہ بکھرتیں کاش چچا چچی بیٹی بیٹے میں فرق محسوس نہ کرتے۔

رشتے کی سوغات

وہ چاند کی ستائیس تاریخ تھی۔ روزانہ مشرق سے مغرب تک کے سفر سے تھکا ماندہ
چاند اپنے حجرہ میں آرام کر رہا تھا۔ رات سیاہ وڈراؤنی تھی۔ تاروں کی چمک کو بھی سیاہ گھٹاؤں نے
اپنے آنچل میں چھپا لیا تھا۔ ہر طرف پر ہیبت سناٹوں کا راج سر پھری ہواؤں کی سرسراہٹ جھینگروں
کی جھائیں جھائیں، گیدڑوں اور کتوں کی آوازیں ہم آہنگ ہو کر ایسے سُر پیدا کر رہی تھیں مانو
بہت سی بے چین آتمائیں مکتی کے لیے بے قرار ہوں بڑے سے بڑا شیر دل انسان اس منظر کی تاب
نہیں لے سکتا تھا۔

لیکن ان میں سے کسی پر اس ہیبت ناک سناٹے کا رتی بھی اثر نہیں تھا ان کے واسطے ڈر
خوف جیسے الفاظ اپنی اہمیت کھو چکے تھے وہ سب نو وارد کی داستان سننے کو یہاں جمع ہوئے تھے جو
چند روز پہلے ہی ان میں شامل ہوا تھا۔ یہاں کا دستور تھا کہ جو بھی آتا اپنی آپ بیتی ضرور سناتا۔

نو وارد نے اُن سب پر ایک اُچٹتی نظر ڈال کر کہنا شروع کیا۔ صاحبان آپ لوگوں کے
ذوق وشوق کو دیکھتے ہوئے میں اپنی کہانی شروع کرتا ہوں۔

دریائے گنگا پر بنے انگریزی حکومت کے زمانے کے اُس پُل کو خطرناک قرار دے کر
نئے پُل کی تعمیر کا کام شروع تو ہو گیا تھا لیکن خطرناک کے لیبل کے باوجود ٹرینوں کی آمد ورفت
بدستور قائم تھی۔ اتنی احتیاط ضروری تھی کہ ٹرین کی رفتار پُل کراس کرتے ہوئے کم کر دی جاتی تھی۔
ملک کے اکثر و بیشتر پلوں کی یہی کیفیت ہے جس پر شب و روز ٹرینوں کی آمد و رفت ہے یہ مسافر کا
نصیب ہے منزل مقصود پر پہنچے یا راہ میں دریا بُرد ہو گئے ایک ارب کی آبادی والے ملک میں چند
ہزار کی موت سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وارثوں کی اشک شوئی کے لیے چند ہزار کے سکّے کشکول میں
ڈال دیے جاتے ہیں ٹی۔ وی پر چند معتبر ہستیوں کے چہرے نظر آئے چند رٹے رٹائے فقرے
''ہمیں افسوس ہے مرنے والوں کی سات پشت سے ہمدردی ہے وغیرہ وغیرہ۔''

لیکن ان حادثوں میں کوئی ان بیواؤں سے پوچھے جن کی مانگ کا سیندور مٹ جاتا

ہے۔ ماؤں کی گودیں سونی ہو جاتی ہیں بہنوں کے کڑیل جوان بھائی خواب وخیال ہو جاتے ہیں سب سے زیادہ دردناک کیفیت ان بچوں کی ہوتی ہے جو ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت سے یکسر محروم ہو کر اس بے رحم اور بے حس دنیا میں وقت کی تھپڑیں کھانے کو زندہ بچ جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت مسخ ہو جاتی ہے۔ ذات میں ایک ادھورا پن ایک خلا باقی رہ جاتا ہے۔ وراثت میں ملی نیکیاں فطرت میں رچی خوبیاں ذات کی اندھیری قبر میں دفن ہو جاتی ہیں ایک آدھا ادھورا انسان جو سماج کے لیے ایک گالی بن جاتا ہے۔ صاحبان، میں انہیں بدنصیبوں میں سے ایک تھا جس کے والدین کسی عزیز کی تعزیت کو گھر سے گئے اور کبھی لوٹ کر نہ آئے۔ پُل ٹوٹا ٹرین کی بوگیاں دریا برد ہوئیں ہر طرف آہ و بکا شور پکار امدادی پارٹیاں پولیس وغیرہ۔

گنگا ماں نے اپنے نونہالوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے سینہ سے لگا لیا۔ اور یہ نہ سوچا کہ ان کی آغوش میں سونے والوں کے نونہالوں کا کیا بنے گا۔ قصہ مختصر میں اس بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا۔ بچپن وقت کی ٹھوکروں میں روندا گیا۔ انسانی جسم میں سب سے زیادہ ظالم بے رحم غیرت چیز پیٹ ہے دن شروع ہوتے ہی یہ ''ھل مِن مَزِید'' کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ اس کی پکار پر انسان محنت مزدوری چوری چکاری قتل کے لیے ساری ہر کام پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

میں دنیا میں تنہا تھا یہ شاید نیک والدین کے خون کی تاثیر تھی کہ میں نہ کبھی کسی تنظیم سے وابستہ ہوا اور نہ کوئی خلاف قانون کام کیا۔ ہاں بوٹ پالش سے لیکر پتھر توڑنے تک ہر طرح کی مشقت سے واسطہ پڑا۔ جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا وقت کا لگایا ہوا گھاؤ بھرتا گیا۔ پتہ نہیں والدین مجھے کیا بنانا چاہتے تھے ڈاکٹر، انجینیر، مصنف یا پھر کوئی بڑا بزنس مین۔ عموماً امیر غریب ہر طبقہ کے والدین کی یہ خواہش یکساں ہوتی ہے کہ انکا بچہ بڑا ہو کر بڑا آدمی بنے۔

کہتے ہیں ایک شخص اپنے دو بچوں کو لیکر کسی جوتشی کے پاس گیا اور دریافت کیا کہ اس کے بچے بڑے ہو کر کیا بنیں گے۔ جوتشی نے فوراً زائچہ تیار کیا ستاروں کی چال دیکھی۔ سورج کس گھر میں آرام کر رہا ہے۔ چاند کس برج میں براجمان ہے۔ بابو تیرے دونوں بچے بہت بڑے آدمی ہونگے جوتشی نے کہا۔ اچھا مگر کیا بنیں گے باپ نے خوش ہو کر اس طرح پوچھا گویا جوتشی ساتویں آسمان کی خبر لایا ہو۔ سن تیرا بڑا بیٹا جس طرف جائے گا ہر دروازہ اس کی پہلی دستک پر کھل

جائے گا۔ بڑی سے بڑی ہستی اس کا انتظار کریگی اور دوسرا اس کے ایک اشارے پر بڑے سے بڑے سرمایہ دار رک جائے گا۔ باپ خوش خوش گھر لوٹا وہ دنیا کا کتنا خوش نصیب باپ ہے بھلے وہ ایک معمولی چپراسی ہے۔ لیکن آنے والے دنوں میں اس کے بچے بڑے آدمی ہونگے۔ پھر وقت پر لگا کر اُڑا اسکا بڑا بیٹا ''پوسٹ مین'' اور چھوٹا ٹریفک کنٹرول کانسٹیبل بن گیا۔ جوتشی کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی ہاں تو میں کہہ رہا تھا میرے والدین کے بھی کچھ خواب ہونگے جو انکے ساتھ سو گئے۔

محنت کرنا، پیسا کمانا پیٹ بھر کھانا اور لمبی تان کر سو جانا میرے روٹین میں تھا میری صحت قابل رشک تھی اور کیوں نہ ہوتی؟ کمانا کھانا سونا اس کے علاوہ دنیا کی کوئی فکر نہ تھی۔ کسی رشتے کی دوڑ میں بندھا ہوا نہیں تھا کوئی ایسا نہیں تھا جسے اپنا کہہ سکتا جس کے دکھ پر غمگین ہوتا۔ مجھے دنیا کا کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ بچپن سے کتابوں کے بجائے انسانی چہرے پڑھتے تھے اچھے ڈیل ڈول پر گھنی مونچھیں میرے چہرے کو بارعب بناتی تھیں۔

رام گڑھ کا اسٹیشن معمولی تھا لیکن اترانچل کی طرف نئی لائن ڈال کر جنکشن بنایا جا رہا تھا۔ رحمت خاں ٹھیکیدار نے مجھے مزدوروں کی دیکھ ریکھ اور حساب کتاب پر لگا دیا تھا پینتالیس پچاس کے قریب مزدوروں نے چھولداریاں لگا کر ایک چھوٹی سی بستی بسا رکھی تھی۔ جہاں دن بھر کی مشقت کے بعد وہ کھاتے پکاتے اور گا بجا کر دن بھر کی تھکن اتارتے رات کا کھانا کھا کر چہل قدمی کرنا میری عادت میں شامل تھا۔ پٹری کے برابر چلتے چلتے میں دور نکل آیا۔ اچانک ایک طرف سے ایک نسوانی چیخ کی آواز آئی بچاؤ بچاؤ۔ آنکھیں پھاڑ کر میں نے اس سمت دیکھا اور دو ایک جستوں میں درمیانی فاصلہ پار کیا۔ کون ہے؟ قریب جا کر میں نے ڈپٹ کر کہا۔ وہ کوئی لڑکی تھی جسے انسانی نما شیطانوں نے پکڑ رکھا تھا۔

میری آواز سے تقویت پاتے ہی لڑکی نے کسی طرح اپنا بازو آزاد کرالیا اور بھاگ کر میری پیٹھ کے پیچھے چھپنے لگی بھائی خدا کے لیے مجھے ان درندوں سے بچالو۔ خبردار آگے مت بڑھنا یہ میری پناہ میں ہے۔ میں نے ڈپٹا۔ ہٹو سامنے سے یہ میری بیوی ہے اسے دماغی دورے پڑتے ہیں ایک میرے مقابل آتے ہوئے عیاری سے بولا۔

یہ جھوٹ بولتا ہے میری عزت لوٹنا چاہتا ہے لڑکی چلائی۔ میری قابل رشک صحت کام

آئی تھوڑی سی ورزش کے بعد دونوں جان بچا کر ایک سمت بھاگ نکلے۔کون ہوتم کہاں سے آئی ہو؟ان غنڈوں کے ہاتھوں کیسے لگ گئیں میں لڑکی کی طرف مڑا۔میں بری لڑکی نہیں ہوں حالات کی ستائی ہوئی ہوں میں آپ کو سب کچھ بتادونگی لڑکی نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان اٹک اٹک کر کہا۔

میں اس کو لیکر اپنی عارضی رہائش پر واپس آیا۔یہاں آرام سے بیٹھو صراحی سے پانی گلاس میں انڈیل کر اسے دیتے ہوئے میں نے کہا جسے وہ ایک ہی سانس میں خالی کر گئی۔ اندھیرے کے سبب یا شاید گھبراہٹ میں اس نے میرے حلیہ پر غور نہیں کیا تھا۔میرے تن وتوش اور گھنی مونچھوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر بے پناہ گھبراہٹ نظر آئی۔شاید وہ کڑہائی اور تندور کے محاورے پر غور کر رہی تھی۔

میں چہرے پڑھنے کے فن سے شناسا تھا۔فوراً سمجھ گیا کہ مجھے دیکھ کر وہ پہلے سے بھی زیادہ خوف زدہ ہے۔وہ چاروں طرف اس طرح دیکھ رہی تھی مانو بھاگنے کے لیے راہ متعین کر رہی ہو۔اب میرے لیے ضروری تھا کہ اس کی کہانی سننے سے پہلے اس کا خوف دور کروں۔سنوتم جو کوئی بھی ہو میری پناہ میں ہوتم نے مجھے بھائی کہا ہے میں نے یہ لفظ پہلی مرتبہ تمھارے منھ سے سنا ہے۔ میری کوئی بہن نہیں ہے بلکہ اس بھری دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔میرے حلیہ سے خوف زدہ مت ہو لوگوں کو پہچاننا سیکھو۔یہاں معصوم چہروں کے پیچھے بہت کچھ ہوتا ہے۔بڑے بڑے درندے نیکی اور شرافت کی کھال اوڑھے ہر برے کام میں ملوث ہوتے ہیں۔خیر چھوڑو یہ باتیں مجھے بتاؤتم کون ہو؟ان غنڈوں کے ہاتھوں کیسے لگ گئیں میں نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

بھائی سچ کہتے ہو معصوم چہروں کے پیچھے بہت کچھ ہوتا ہے،سنو ہاسپٹل کے بیڈ پر ہوش آتے ہی میری سماعت وبصارت بیدار ہوئی۔چاروں طرف عورتیں مرد بچے بوڑھے زخمی حالت میں تھے ہر طرف آہ وبکا تھی نرسیں اور ڈیوٹی ڈاکٹر آجا رہے تھے۔کافی دیر غائب دماغی سے سب کچھ دیکھتی رہی۔

آہستہ آہستہ سب یاد آتا گیا۔ماں باپ بہن بھائی اور وہ وحشت ناک منظر صبح کا وقت اچانک زور کی دل ہلا دینے والی آواز۔دومنزلہ مکان کا گرنا جس کے نیچے میرے اپنے زندہ دفن

ہو چکے تھے۔ شاید قدرت کو میری زندگی منظور تھی میں لان میں پودوں کی دیکھ ریکھ میں لگی تھی۔ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں خدا معلوم جھٹکے سے یا دہشت سے بیہوش ہو کر گری تھی۔ سر میں شدید چوٹ آئی تھی۔ بے خبری سے باخبری کا سفر طے کرتے کرتے میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ زندگی میں کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ قہر خداوندی زلزلہ کی شکل میں بھُج کی سرزمین پر ٹوٹا تھا۔ زندگی جس کو خدا کی نعمت کہا جاتا ہے وبال بن گئی۔

بیٹی تمھاری طبیعت اب کیسی ہے ایک مہربان آواز کانوں میں پڑی۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون مجھ پر جھکی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں پھلوں کا لفافہ تھا میری آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ انہوں نے مجھے زبردستی پھل کھلائے دیر تک تسلی و تشفی کرتی رہیں جب تک ہاسپٹل میں رہی وہ برابر آتی رہیں۔ بیٹی زمانہ بہت برا ہے تم یہاں کس کے پاس رہو گی اللہ رکھے حسین ہو جوان ہو مجھ پر بھروسہ کرو۔ تمھاری جتنی میری بھی کتنی بیٹیاں ہیں میں تمھیں اپنی بیٹی کی طرح رکھونگی میری داستان سننے کے بعد خاتون نے پر محبت لہجہ میں کہا۔ میرے لیے ان کی بات ماننے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ وہ مجھے لیکر اس شہر میں آگئیں۔ پر تعیش کوٹھی دیکھ کر میں دنگ رہ گئی۔

خاتون جنہیں میں خالہ کہنے لگی مجھ پر ضرورت سے زیادہ مہربان تھیں۔ حالانکہ ان کی خود چھ لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے دوسرے ہی روز میرے لیے قیمتی ملبوسات جیولری جوتے ڈھیر کر دیے میری آنکھیں اکثر بچھڑنے والوں کی یاد میں اشکبار رہتیں۔ خالہ مجھے روتا دیکھ کر بے چین ہو جاتیں۔ بیٹی تمھاری یہ حسین آنکھیں آنسوؤں کے لیے نہیں بنیں بھول جاؤ سب کچھ دیکھنا تم شہزادی جیسی زندگی بسر کروگی۔ مجھے خالہ روشنی نور اور ممتا کا ایک ایسا منارہ نظر آتیں جس کی کرنیں مستقبل کی ضمانت ہوں یہ زندگی سامانِ تعیش میری سوچ سے کہیں زیادہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود کہیں کچھ تھا جس کی کھٹک ذہن کے پردوں پر ہوتی یہ کھٹک خالہ کے یہاں آنے والے بے تحاشہ رشتہ دار تھے جن سے ان کی بیٹیاں بے تکلفی سے ملتی تھیں۔ خالہ کے بقول ان کے بھانجے بھتیجے بکثرت تھے۔ دن ڈھلے آتے اور دیر رات تک رکتے۔ اکثر خالہ کی بیٹیوں میں سے کوئی ایک ان کے ساتھ چلی جاتی۔ ایک بار عائشہ کے جانے پر میں کہے بغیر نہ رہ سکی۔ خالہ اتنی رات کو عائشہ عدنان بھائی کے ساتھ کہاں گئی ہے۔

بیٹی عدنان کی ماں کی طبیعت خراب ہے۔ بیچارہ اکیلا مرد ذات کیا کرسکتا ہے۔ میں نے عائشہ کو بھیج دیا اس کی ماں میری سگی خالہ زاد ہے۔ خالہ نے مسکینیت سے جواب دیا۔ میں کہنا چاہتی تھی اس موقع پر آپکو خود جانا چاہیے تھا لیکن صرف سوچ کر رہ گئی وہ میری محسن تھیں ان کے بارے میں غلط سوچنا بدترین احسان فراموشی ہوتی۔ لیکن میری چھٹی حس برابر کسی خطرہ کا الارم بجا رہی تھی۔

اب خالہ کبھی کبھی چائے یا کافی لیکر مجھے ڈرائنگ روم میں بھیجتیں۔ اور آنے والے کچھ اس طرح تعریفی نظروں سے اس طرح دیکھتے مانو میں شوپیس میں سجا کوئی ڈیکوریشن پیس ہوں۔ شام سے میرے سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ ہلکی حرارت بھی محسوس ہو رہی تھی میں ڈرائنگ روم سے ملحقہ کمرے میں جا کر بیٹھ گئی۔ ڈرائنگ روم سے آنے والی آوازوں نے مجھے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔

آخر کب تک انتظار کراؤ گی۔ اس کے ملبوسات اور زیورات کے بہانے کافی رقم لے چکی ہو۔ ایک مردانہ آواز۔ آخر ایسی جلدی بھی کیا ہے کسی نہ کسی کو تو تمھارے ساتھ بھیجتی ہوں یہ خالہ کی آواز تھی۔

تم جانتی ہو پرانی چیزیں مجھے اٹریکٹ نہیں کرتیں۔ تم نے بچ سے آنے کے دوسرے ہی روز مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ میں اب مزید انتظار نہیں کرسکتا۔ ''بس دو چار روز اور انتظار کرلو'' یہ آواز روشنی کے مینار سے آئی تھی۔ میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ اس عورت کے چہرہ کا نقاب اتر چکا تھا۔ یاالٰہی میری حفاظت کرنا میرے دونوں ہاتھ بلند ہوئے کتنی دیر میں مالک حقیقی کے سامنے گڑگڑاتی رہی میری آنکھیں بے آواز اشک بہا رہی تھیں۔ کافی دیر رونے کے بعد میں نے آنسو صاف کیے۔ اور اٹھ کر بیٹھ گئی کس طرح اس دوزخ سے باہر نکلوں۔ میرے سامنے دو ہی راستے تھے یہاں سے فرار یا خودکشی۔ خالہ پر ہرگز یہ ظاہر نہیں کرنا چاہیے کہ میں ان کی اصلیت سے واقف ہو چکی ہوں عقل نے رہنمائی کی۔ فرار آسان بات نہیں تھی گیٹ پر ہمہ وقت وزنی تالا لگا رہتا جو صرف آمد و رفت پر ہی کھلتا۔ چوکیدار قریب ہی موجود رہتا۔

خالہ آپ کی اجازت ہو تو میں کچھ دیر لان میں ٹہل لوں رات کا کھانا برائے نام کھا کر میں نے خالہ سے لاڈ سے کہا وہ مطمئن تھیں در قفس کا دانا آسان نہیں ہے شاید بھول گئیں تھیں کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقت ور ہوتا ہے جب خدا کی مدد شامل حال ہوتی ہے تو ہر

راہ ہموار ہو جاتی ہے ٹہلنے کا تو بہانا تھا۔ میں نے گیٹ سے قریب مہندی کی باڑھ میں اپنے کو چھپالیا اور دل ہی دل میں خدا سے رحم کی بھیک مانگتی رہی قدرت کو جلدی ہی مجھ پر رحم آ گیا۔ اچانک کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن ہوئی ہارن بجا چوکیدار نے گیٹ وا کیا جیسے ہی چوکیدار مڑا۔ میں نے گیٹ سے باہر دوڑ لگا دی۔ شہر کے راستوں سے ناواقف تھی اندھا دھند بھاگتی چلی گئی۔ کافی دور چلنے کے بعد اپنے پیچھے بھاری قدموں کی گونج سنائی دی غالباً میرے فرار کا راز کھل چکا تھا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری وہ دونوں میرے قریب آ چکے تھے ایک نے بڑی بے دردی سے میرے بازو کو دبوچ لیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپکے سامنے ہے۔

لڑکی کی داستانِ غم سن کر میں سوچوں کے بھنور میں چکرانے لگا مجھے لگا میرے اندر گھمسان کا رن پڑا ہوا۔ دل کچھ کہہ رہا تھا دماغ کچھ اور روح کی سرگوشیاں ضمیر کی للکار غرض عجیب و غریب شور برپا ہو۔

میں تنہا نوجوان، ایک حسین لاوارث لڑکی مجھے اس کو سہارا دینا ہے مگر کیسے؟ کیا نکاح کا بندھن؟ ہرگز نہیں اس نے مجھے بھائی کہا ہے زندگی میں پہلی بار ایک خوبصورت پاکیزہ رشتے کی سرگوشی سنائی دی ہے۔ ایسا سوچنا بھی گناہ ہے دماغ نے دلیل دی پھر پھر۔ ایک مرد کسی عورت کو نکاح کے بندھن میں باندھ کر ہی سہارا دے سکتا ہے۔ مجھے یہی کرنا چاہیے پھر اندر کہیں نہیں نہیں کی گردان ہونے لگی۔ الفاظ بھائی بہن ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگے۔ الفاظ اپنی اہمیت کبھی نہیں کھوتے۔ انسانی زبان سے نکلنے والے الفاظ ہی تو ہیں جنہوں نے ایک ہی زمین پر رہنے والے خدا کے بندوں کو حد بندیوں پر مجبور کر دیا ورنہ سپر پاور تو ایک ہی ہے الفاظ کبھی اپنی اہمیت نہیں کھوتے۔

وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کا اعتماد کرچی کرچی ہو چکا ہے۔ وہ جس کو نجات دہندہ سمجھیں وہ اس کی عصمت وعفت کی خریدار نکلی۔ اس نے مجھے بھائی کہا ہے بھائی بہن کا محافظ اس کا سائبان ہوتا ہے۔ میں ایک بھائی بن کر اس کی حفاظت کروں گا خواہ کچھ بھی ہو۔ میں نے تہیہ کر لیا۔ میں کسی سے مشورہ کرنا چاہتا تھا مگر کس سے رحمت خاں سے علیک سلیک اور شناسائی ضرور تھی لیکن اسے دوستی کا نام نہیں دے سکتا تھا بہت سوچنے کے بعد میں نے رحمت خاں کو سب کچھ بتا دیا اور

ساتھ ہی کسی شریف نو جوان کو تلاشنے کو بھی۔ رحمت خاں فطرتاً نیک اور شریف نو جوان تھا۔ والدین کا سایہ سر سے اُٹھ چکا تھا۔ اس کی شادی کا مسئلہ التوا میں پڑا تھا۔ لڑکی کی درد بھری داستان کا اثر تھا یا پھر اس کے بے پناہ حسن کی کشش رحمت خاں نے میرے سامنے اپنا آپ پیش کر دیا۔ میں امکان بھر جو کر سکتا تھا وہ سب ان کے سامنے ڈھیر کر دیا۔ قرآن کے سائے میں میں نے عائشہ کو رحمت خاں کے ساتھ رخصت کر دیا۔ دونوں کی ازدواجی زندگی بہت کامیاب رہی چند سال میں ان کے آنگن میں دو پھول کھل چکے تھے عائشہ کے بچے مجھے ماما کہتے میں اب رشتوں کی ڈور میں بندھ چکا تھا۔ اسے ایک بہن کی طرح میرا گھر بسانے کی جلدی تھی۔ اُس نے کتنی لڑکیوں کے فوٹو مجھے دکھائے آخر ایک پسند آ ہی گئی۔ اب رحمت خاں کے ساتھ میں بھی ٹھیکے لینے لگا تھا۔ شہری مضافات سے دور ایک پلیا تعمیر ہو رہی تھی۔ رات کے تقریباً نو بجے ہو نگے میں نے واپسی کے لیے جیسے ہی بائک اسٹارٹ کی دو سائے حرکت کرتے نظر آئے۔

یہی ہے وہ سالہ جس نے سونے کی چڑیا چھینی تھی سرگوشی سنائی دی۔ لمحوں میں دونوں بائیں طرف سے نکل کر سامنے آ گئے۔ دیکھو بھائی تم سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ بس لڑکی ہمارے حوالے کر دو اب تک تو تم نے اس سے خاصا کما لیا ہوگا ایک بولا۔ مجھے لگا میرے سر پر انگاروں کی بارش ہو رہی ہو۔ کیا بکواس کرتے ہو کیا تم لوگ اپنی بہنوں سے پیشہ کراتے ہو۔ بہن دونوں کا قہقہہ بڑا بے ساختہ تھا۔ بہن بنا کر رکھا ہوا ہے۔ میرا گھونسہ ایک کے جبڑے پر پڑا وہ منہ دبائے ایک طرف پڑ گیا تبھی اچانک دوسرے نے ریوالور نکال کر گولی چلا دی ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

ڈاکٹروں نے آپریشن کر کے گولی نکال دی خون کافی بہہ گیا تھا لمحہ بھر کو ہوش آیا عائشہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ پھر کچھ یاد نہیں اب بھی وہ کبھی کبھی آتی ہے اور بھائی کہہ کر مٹی کے ڈھیر سے لپٹ کر گھنٹوں روتی ہے۔

صبح صادق کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ تاروں کی چمک ماند پڑ رہی تھی۔ وہ سب اپنی اپنی قبروں میں غائب ہو گئے۔

مائی

''بھاگو بچو مائی آ گئی'' گراؤنڈ میں کھیلتے بچے چلا اُٹھے۔ اورآنِ واحد میں اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے میرے تینوں بچے بھی گیٹ کے اندر آ گئے۔ میں نزدیک ہی تھی بچوں کو تیزی سے اندر آتا دیکھ کر گھبرا گئی۔

''کیا ہوا اشعر'' میں نے بڑے بچے سے جاننا چاہا۔

''ممی مائی آ گئی''۔ وہ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولا۔

''کون مائی''؟

''پتہ نہیں'' اشعر سے چھوٹے اصغر نے کہا۔

میں نے سامنے دیکھا ایک بوڑھی عورت میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ایک ہاتھ میں لاٹھی اور دوسرے میں ایک پوٹلی دبائے گوندنی کے درخت کے تنے سے لگی ویران آنکھوں سے گیٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''اوہ تو اس پاگل عورت سے ڈر کر بچے بھاگے ہیں''۔ تینوں بچے میری اوٹ لیکر اسے دیکھ رہے تھے۔

''ممی گیٹ بند کیجئے''۔ ننھی سامعہ کچھ زیادہ ہی خوف زدہ تھی۔

میں نے گیٹ بند کیا اور بچوں کو لے کر اندر آ گئی۔ میں اس مکان میں نئی نئی آئی تھی۔ انور سرکاری ملازم تھے روز روز کے ٹرانسفروں نے جان عذاب میں کر دی تھی۔ بچوں کی پڑھائی الگ متاثر تھی۔ کبھی اس شہر کے اسکولوں میں بھاگ دوڑ۔ کبھی دوسرے شہر میں ایڈمشن کی کوشش۔ وہ تو غنیمت تھا کہ میری ساس صاحبہ نے بڑے بیٹے کے ساتھ آبائی مکان میں رہنا منظور نہیں کیا اور میرے ساتھ دربدر ہوتی رہیں یہ شاید ان کی انور اور بچوں سے بڑھی ہوئی محبت اور میری خدمت گزاری تھی ورنہ بڑی بہو سے بنتی ہی نہیں تھی بہر حال ان کی محبت نے مجھے تنہائی محسوس نہیں ہونے دی میں نے بھی حقیقی ماں کی طرح ان کی خدمت اپنے اوپر فرض کر لی تھی۔ بچے دادی کے پاس بیٹھ گئے۔

''دادو'' اور ہم گراؤنڈ میں سامنے والی آنٹی کے بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہے تھے تب ہی وہاں مائی آ گئی'' اشعر نے دادی کو مطلع کرنا ضروری خیال کیا۔

''ہاں دادو مجھے بھی بڑا ڈر لگا''۔ اصغر نے بھی اپنا فرض ادا کیا۔

''اور مجھے بھی''۔ ننھی سامعہ نے بھی بولنا ضروری سمجھا۔

''اے ہے کون مائی''۔ انہوں نے میری طرف مستفسرانہ دیکھا۔

''معلوم نہیں امی کوئی پاگل عورت تھی بچے اس کے ڈر سے کھیل چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے''۔ کہہ کر میں نے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ اب وہاں نہیں تھی شاید بھوکی پیاسی ہو کھانے کی تنگ دور میں یہاں آئی ہو مجھے اس کو کچھ کھانے کو ضرور دینا تھا مجھے اپنی کوتاہی پر دلی رنج ہوا۔ لیکن کرتی کیا دراصل بچوں کے خوف کی وجہ سے میں خود گھبرا گئی تھی۔

دوسری صبح بچوں کے اسکول اور انور کے آفس جانے کے بعد ابھی میں صفائی وغیرہ سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ سامنے والے مکان سے آسیہ خالہ آ گئیں۔ میری ساس کی ہم عمر ہونگی بہت ہی شفیق اور ملنسار قسم کی بزرگ تھیں جلدی ہی اس طرح گھل مل گئیں مانو برسوں کے تعلقات ہوں۔

''اے آسیہ بہن کل تو بچے بری طرح ڈر گئے''۔ سلام دعا کے تبادلے کے بعد میری ساس نے کہا۔

''کیوں کیا ہوا''؟

''اسے کہتے تھے مائی آ گئی۔ میں جانوں کوئی پاگل عورت تھی۔

''اوہ کنیز ہوگی بڑے دنوں میں چکر لگایا۔ عرصے سے کوئی پتہ نہیں تھا''۔ آسیہ خالہ کے لہجے میں عجیب سا کرب تھا'' خالہ سامعہ تو اس قدر ڈر گئی تھی کہ سوتے میں اچھل رہی تھی''۔ میں نے بتایا۔'' دلھن بچے تو بچے ہی ہیں بلا وجہ ڈرتے ہیں وہ بچوں سے کچھ نہیں کہتی بلکہ ترس کھا کر دکان دار اور ہوٹل والے کھانے پینے کی جو چیزیں دیتے ہیں وہ بھی بچوں کو دینے کی کوشش کرتی ہے''۔ آسیہ خالہ نے بتایا'' خالہ کون ہے یہ کنیز؟''۔ میرے اندر تجسس نے سر ابھارا۔

''بڑی دکھ بھری کہانی ہے خیال کر کے کلیجہ منہ کو آتا ہے''۔ آسیہ خالہ نے کہا۔

''کیا ہوا بیچاری کے ساتھ؟'' میری ساس نے متاثر ہو کر دریافت کیا۔

آج جس مکان میں تم لوگ ہو یہ دراصل کنیز کا ہی ہے۔ میری اور اس کی شادی مہینہ دو مہینے کے فرق سے ہوئی تھی ماں سوتیلی تھی اس نے اپنے سر کا بوجھ اتارنے کو کم عمری میں بیاہ دیا۔ دین محمد نیک اور شریف انسان تھا کسی مل میں مزدوری کرتا تھا۔ کنیز بھی پاکیزہ شکل وصورت کے ساتھ ساتھ ہنس مکھ قناعت پسند اور ہنر مند تھی۔ ہر کسی کے کام آنے والی روتوں کو ہنسانے والی جلدی ہی وہ پاس پڑوس میں بھی ہر دل عزیز ہو گئی۔ تین سال میں وہ دو بیٹوں کی ماں بن گئی۔ بچوں کے معاملے میں ویسے تو ہر ماں جذباتی ہوتی ہے لیکن وہ کچھ زیادہ ہی پاگل تھی۔ حیثیت معمولی تھی لیکن شکوہ کرنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ جو مل گیا کھا لیا جیسا مل گیا پہن لیا بس اپنے شوہر بچوں میں مگن۔ لیکن اس کی خوشیاں شاید وقت کو بھائیں نہیں تبھی اس نے ایک زبردست ٹھوکر لگائی۔ دین محمد بھلا چنگا گھر سے گیا اور ایک تیز رفتار ٹرک کی زد میں آ کر چار کاندھوں کا بوجھ بن کر گھر واپس آ گیا۔

وہ پتھر کی مورت میں ڈھلی بے وقت جانے والے کو حسرت زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کرنے والا ایک لفظ کہے بغیر اس کی دنیا سے چلا گیا۔ سب نے تسلی دلاسہ دینا اپنا فرض جانا۔

''بیٹی حکم خداوندی میں کوئی چارا نہیں وہ اتنی ہی لکھوا کر لایا تھا اپنے بچوں کو دیکھ اب تو ہی ان کی ماں ہے تو ہی باپ'' ایک بزرگ خاتون نے اسکی توجہ بچوں کی طرف مبذول کرائی۔

وقت کے قدم آگے بڑھے وہ اپنے بیٹوں کی ماں اور باپ دونوں بن گئی بچے اس کی زندگی کا محور تھے۔ چند دور پرے کے رشتے داروں اور ہمدرد پڑوسیوں نے اسکی امداد کرنا چاہی لیکن اس کی خودداری نے گوارا نہیں کیا۔ پورا دن اور کبھی کبھی آدھی رات تک وہ سلائی مشین پر جھکی اُجرت پر کپڑے سیتی۔ بچوں کے حوالے سے اسکی آنکھوں نے سنہرے خواب دیکھنا شروع کر دیے۔ تصور کی آنکھ سے وہ انکو بڑا ہوتا دیکھتی۔ وہ انہیں پڑھائے گی لکھائے گی۔ اچھا شہری بنائے گی۔

جن درختوں کی آبیاری وہ اپنے خونِ جگر سے کر رہی ہے ایک دن انکی گھنیری چھاؤں میں آنکھیں موند کر زندگی بھر کی تھکن مٹائے گی۔ کم عمر بیوہ تھی کچھ نے نکاح ثانی کا مشورہ بھی دیا۔

''سب کچھ کہنا بس یہ گالی مت دینا مرنے والا اپنی نشانیاں چھوڑ گیا ہے۔ انہیں بڑا

ہونے دو پھر دیکھنا تمھاری کنیز کیا سے کیا ہو جائے گی"۔ اس کا جواب ہوتا۔

بڑا فرحان سیدھا سادہ تھا اس کے برعکس چھوٹا فراز ضرورت سے زیادہ شرارتی اور لڑاکو تھا۔ محلے کے لڑکوں سے لڑتا بھڑتا گالی گلوچ کرتا۔ لیکن کنیز کا خیال کر کے کوئی اسے معمولی اسی سرزنش سے زیادہ کچھ نہیں کہتا۔

دن رات کے چکر میں دونوں لڑکے اس کے قد سے اونچے ہو گئے۔ ساتھ ہی اس کی آنکھوں کی چمک بھی تیز ہو گئی۔ آبلہ پائی کے کٹھن راستے کے سامنے ہی منزل کے نشان نظر آرہے تھے۔ جس روز اس کے بڑے بیٹے نے ہائی اسکول پاس کیا لگتا تھا کنیز کو کسی خزانے کی چال مل گئی۔ اس قدر خوشی تو وہ والدین بھی نہیں مناتے جس کے بچے امریکہ سے اعلیٰ ڈگریاں لیکر آتے ہیں۔ شاید غریبوں کی خوشیوں کا پیمانہ بھی انہیں کی طرح چھوٹا ہوتا ہے۔ اس نے پورے محلے میں مٹھائی تقسیم کی کنیز کی خوشی میں سب ہی خوش تھے۔

"کنیز تیرا چھوٹا کیا کر رہا ہے؟" اکثر خواتین سوال کرتیں۔ اس سوال پر اس کے چہرے پر ایک تاریک سایہ آجاتا "کیا بتاؤں وہ میری سنتا ہی نہیں اسکول سے بھی بھاگنے لگا ہے جانے کیسے کیسے لونڈوں کے ساتھ رہتا ہے"۔

بھرے گلے سے کنیز جواب دیتی۔

"کسی کام کاج سے لگا دے"۔ مشورہ ملتا۔

"خالہ کئی جگہ بیٹھایا پر بھاگ کھڑا ہوتا ہے دُعا کرو اللہ اسے سیدھی راہ دکھائے"۔

"چل ابھی بچہ ہے ٹھیک ہو جائے گا"۔

فرحان کی نوکری لگنے کی دیر تھی کنیز کے ذہن میں اس کی شادی کا سودا سما گیا۔ سب ہی نے سمجھایا۔ "دیکھ کنیز تو نے بہت دکھ اٹھائے ہیں اس کی کمائی پر پہلا حق تیرا ہے چند روز رک جا"۔ پر اس کی ایک رٹ "اکیلی رہتی ہوں دلھن آئے گی پوتا پوتی ہونگے رونق لگے گی"

چھ مہینے کے اندر بیٹے کا گھر بسا کر لگتا تھا ہفت اقلیم کی دولت اس کے ہاتھ لگ گئی ہو۔ اب اسے فکر تھی تو فراز کی وہ کئی کئی دن گھر سے غایب رہتا۔ اب تو اردگرد کے لوگ بھی دبی زبان سے بہت کچھ کہتے۔

اس کے آنے کی آس لگائے صحن میں ٹہل ٹہل کر رات گزار دیتی۔ آخر کو اولاد تو وہ بھی تھا۔"لا اماں روٹی دے"۔ بارہ بجے وہ گھر میں داخل ہوا۔

"بدنصیب تین روز سے کہاں غائب تھا"۔ چاروں طرف ایک نامانوس سی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ کنیز آندھیوں کی زد میں تھی۔ اس نے بغور بیٹے کا چہرہ دیکھا۔

"تو نے شراب پی رکھی ہے"

"ارے نہیں ماں زندگی کی دوا پی ہے زندگی کی"۔ وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔ کنیز نے موقع کی نزاکت دیکھ کر ہنگامہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ آخر کو گھر میں پرائی لڑکی ہے۔

"ماں میری بات سُن یہ گھر بیچ دے۔ مجھے پیسہ کی ضرورت ہے"۔ اس نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔

"کیا بک رہا ہے گھر بیچ دوں پھر کیا سڑک پر رہیں گے"۔ کنیز نے آواز دبا کر کہا۔ تو نہیں بیچے گی تو میں خود بیچ دونگا۔ فراز نے بے رحمی سے کہا۔

"آہستہ بول کبھی بھائی سن لے"۔ اس نے دبی آواز میں ڈانٹا۔

"سن لے تو سن لے میں کیا اس سے ڈرتا ہوں اس کے حصے کی رقم اس کے ہاتھ پر رکھ دونگا"۔

"تو ہوتا کون ہے گھر کا سودا کرنے والا میں کیا مرگئی ہوں"۔ کنیز نے غصے سے کہا۔

وہ رات قیامت بن کر گزری۔ اس کا بیٹا کس طرح غلط راہوں پر چل نکلا اسکی تربیت میں کہاں کمی رہ گئی وہ کس طرح اسے راہ پر لائے۔ اس نے مالکِ حقیقی کے سامنے دامن پھیلا دیا۔

"اے خدا میں نے کبھی کسی کا برا نہیں کیا میری زندگی تیرے سامنے ہے اے مالک میرے بچے کا راہ راست پر لے آ"۔

لیکن شاید قبولیت کی گھڑی گزر چکی تھی۔ یا پھر اس کی دُعا بابِ مستجاب تک پہنچی ہی نہیں تقدیر کے اسی وار کو قسمت کہا گیا ہے۔ جس کے آگے بڑے سے بڑا صاحب اختیار اور خیالات بے بس و مجبور ہے ایک غریب بیوہ تو کسی گنتی میں ہی نہیں ہے۔ "پیش آنی ہے وہی جو کچھ پیشانی میں ہے"۔ شہر کے چھٹے ہوئے بدمعاش اور غنڈے اس کے یار غار تھے۔ ایک کمزور عورت کہاں تک

پردہ پوشی کرتی ہر کسی کو کنیز سے ہمدردی تھی لیکن کر کیا سکتے تھے۔ پھر ایک دن اس کے دروازے پر خاکی وردی والوں کی بھیڑ دیکھ کر پڑوسی تھرا اُٹھے۔ انہیں فراز کی تلاش تھی جو کوئی سنگین واردات کر کے فرار تھا۔

اپنی معصوم نوزائیدہ پوتی کو سینے سے لگائے وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے تلاشی کی کاروائی دیکھ رہی تھی۔

''میں اب یہاں ایک منٹ نہیں رہونگی یہ گھر نہیں غنڈوں کا گڑھ ہے جس گھر میں پولیس چھاپے مارے وہاں کوئی شریف عزت دار عورت نہیں رہ سکتی''۔ اس کی بہو شوہر کو کوٹ میں پھندنے ٹانک کر آگاہ کر رہی تھی۔ بہو بھی روایتی بہو تھی۔ کنیز کی خدمت، محبت، ناز برداری کچھ بھی تو اس کے دل میں جگہ نہ بنا سکیں۔ چند دن بنا آہٹ اور گزر گئے۔

ایک منحوس صبح سورج کی کرنیں دنیا کو روشنی کا پیغام دینے آئیں کنیز کی دنیا میں ابدی اندھیرا پھیل گیا اس نے دیکھا اس کا سیدھا سادھا محبت کرنے والا بیٹا بیوی کے ساتھ مل کر کمرے کا سامان اکٹھا کر رہا ہے۔ اس نے گود میں سوئی پوتی کو جلدی سے کاٹ میں لٹایا اور کمرے میں داخل ہوگئی۔

''یہ سب کیا ہے تم لوگ کہاں جا رہے ہو'' اس نے بیٹے کو جھنجوڑا۔

''اماں'' وہ ہم لوگ.........وہ ہکلا کر رہ گیا۔

''یہ کیا بتائیں گے مجھ سے سنو تمھارے لاڈلے نے گھر فروخت کر دیا ہمیں تو بے ایمان نے آدھی سے بھی کم رقم دی اس میں تو کوئی چھوٹا موٹا کوارٹر بھی مشکل سے ملے گا''۔ بہو کی وضاحت سے اسکا سینہ دکھ سے پھٹنے لگا۔ ''گھر فروخت ہو گیا'' اس نے شاید یہی دو الفاظ سنے۔ ''کیا وہ مر گئی تھی کیا اس کے بچوں نے اس کے زندہ وجود کو بھلا دیا۔ اپنے سائے اور چھت دونوں کی بے سائبانی دیدی۔ وہ کیا کریگی کہاں جائے گی اسے بڑی زور کا چکر آیا۔ سہارے کے لیے اس نے دیوار کا سہارا لیا۔

''کس نے خریدا میرا مکان؟ کہاں ہے رقم؟ وہ ہزیانی انداز میں چیخ اُٹھی اور بڑھ کر بیٹے کا کندھا تھام لیا بیٹے کے دل کو ایک لمحے کے لیے کچھ ہوا۔

''ارے تم کہاں فضول میں الجھ گئے میں کہتی ہوں گاڑی لاؤ سامان رکھو''۔ بیوی کی آواز سے وہ کمزور لمحے کی گرفت سے آزاد ہوگیا۔ اس نے باہر کھڑی گاڑی پر سامان رکھنا شروع کیا۔ اس دوران اردگرد کے لوگ اور خواتین اکٹھا ہونا شروع ہو گئے۔ مختلف آوازیں، بھانت بھانت کی بولیاں، ریمارکس۔

لیکن وہ بدنصیب سن ہی کہاں رہی تھی دھول مٹی سے اٹے فرش پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں زندگی بھر کی آرزوئیں قتل ہو کر اس کی آنکھوں کو خونی سوغات دے گئی تھیں۔ اس نے اندھوں کی طرح چاروں طرف ہاتھ مارے شاید آس امید کا کوئی سرا ہاتھ آجائے۔ لیکن وہاں دھول مٹی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بیٹا چلا گیا بہو چلی گئی اس کے بڑھاپے کا کھلونا اس کی معصوم پوتی بھی چلی گئی۔

صحن میں دھوپ اتر آئی وہ ایک ہی رُخ پر بیٹھی رہی اس کی اطراف بھیڑ تھی۔ ہمدرد اور غمگساروں کی بھیڑ۔ سب ہی اس کے کسی نہ کسی طرح قرضدار تھے۔ کسی کی بیماری میں اس نے خدمت کی تھی، کسی کو کھانا پکا کر کھلایا تھا، کسی کے بچے کو پہروں بہلایا تھا۔ کہیں خوشی دوبالا کرنے کے لیے ڈھول بجایا تھا تو کہیں شوہر بیوی، ساس بہو، دیورانی جیٹھانی کے جھگڑوں میں سمجھوتے کی سیڑھی بنی تھی وہ سب اس کے غم کو ہلکا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن کیسے؟؟

سورج کی تمازت بڑھنے لگی تبھی کہیں سے بھولا بھٹکا بادل کا ٹکڑا آیا اور سورج سے گلے ملنے لگا۔ ٹپ، ٹپ کئی نظریں آسمان کی جانب اٹھیں۔ بادل رویا یا سورج کی آنکھ سے اس کی بے کسی پر آنسو ٹپکا۔ دن کے پہر ایک کے بعد ایک گزرنے لگے سب کی منت سماجت کے باوجود کھیل اُڑ کر اس کے منھ میں نہیں گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی ہمراز ور مساز دیواروں اور چھت کو تکتی رہی ابھی دن کا اجالا رات کی سیاہی میں مدغم بھی نہیں ہوا تھا کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی اس نے آس بھری آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا شاید اس کا بے راہ رو بیٹا اس کی تنہائی بانٹنے آگیا۔ ''کون ہے''؟ ایک خاتون دروازے کی طرف بڑھیں۔

''ہم ہیں مالک مکان، آپ لوگ جلدی سے مکان خالی کرو ہم کو اپنا تالہ ڈالنا ہے''۔ تندمند پٹھان نے گونجلی آواز میں کہا۔

''بھیا دو چار روز ٹھہر جاؤ جس کا مکان ہے اسکی طبیعت ٹھیک نہیں ہے''۔ ہمدرد خاتون نے مہلت مانگی۔

''ہم کچھ نہیں جانتا ہم نے مٹھی بھر رقم دیا ہے اس کے بیٹوں نے اسکا خیال نہیں کیا ہم کون ہے''۔ درشتی سے جواب ملا۔

یہاں تک بیان کر کے آسیہ خالہ نے رومال سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ میری ساس بھی آب دیدہ تھیں اور میری کیفیت کچھ نہ پوچھئے۔ میری بڑھی ہوئی حسابیت اور جذباتیت پر انور ہمیشہ مجھے سمجھاتے ''دیکھو جہاں بے حسی بری چیز ہے وہاں حد سے زیادہ حسابیت اچھی علامت نہیں دماغی مریضہ بن کر رہ جاؤ گی''۔

خالہ پھر کیا ہوا؟ میں نے بھرے گلے سے کہا۔

''کیا ہونا تھا بیٹی میں بڑی دقتوں سے اسے اپنے گھر لے آئی میری بہوؤں نے اس کا بڑا خیال رکھا لیکن وہ کئی کئی دن تک نہ کچھ کھاتی نہ ہی بولتی چالتی بس خلاؤں میں نہ جانے کیا تلاش کرتی۔ ایک صبح وہ غائب تھی ہر طرف پتہ کرایا۔ ایک ماہ بعد پتہ لگا تو ایسے کہ وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکی تھی اس کی آنکھیں شناخت کھو چکی تھیں۔ اب بھی کبھی کبھی اس گلی کا چکر لگاتی ہے پہروں اس گھر کو تکتی ہے''۔

''اس کا چھوٹا بیٹا بھی کبھی واپس آیا''؟

''نہیں وہ معمولی وارداتیں کرتے کرتے مجرموں کے گروہ سے جا ملا۔ کچھ روز ہوئے بینک ڈکیتی کی جو واردات ہوئی تھی اس میں وہ بھی تھا پولیس کو سرگرمی سے اس کی تلاش ہے''۔ آسیہ خالہ نے مزید کہا۔

میں رات بھر سو نہ سکی ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ تھا۔ حوا کی بیٹیاں خواہ کسی مذہب و ملت کی ہوں آج بھی وہیں ہیں جہاں سیکڑوں سال پہلے تھیں زمانے جہالت میں اسکو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا لیکن آج کی عورت قسطوں میں مر رہی ہے۔ کبھی باپ کے اونچے شملے میں پھندے لگانے کو اپنی مرضی کے خلاف کسی عمر دار یا دوہاجو سے بیاہ دی جاتی ہے کہیں ظالم شوہر کی بربریت کا شکار ہو کر جلائی جاتی ہے چھت کے پنکھے سے لٹکا دی جاتی ہے۔ پھر کبھی عمر کے آخری پڑاؤ پر اپنے

ہی بیٹوں گود کے پالوں کا نشانہ بن جاتی ہے۔ یہ ایک مائی کی کہانی نہیں آدم کے بیٹوں کا شکار سیکڑوں مائیاں ہوش وخرد سے بیگانہ سڑکوں کی دھول سے ہم آہنگ ہیں۔ آج ہمارے چاروں طرف جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں قتل، غارت گری اغوا عصمت دری یہ سارے عفریت ملک کی جڑوں کو کھوکلا کر رہے ہیں۔ اس معاشرے کی دین ہے کہ بیٹے ماں کے دودھ کا قرض بھول چکے ہیں۔

دوسری صبح اتوار تھا۔ انور نے میرے پژمردہ چہرے کو دیکھ کر مجھے اور بچوں کو باہر گھمانے کا پروگرام بنایا۔ میرا دل قطعی کسی تفریح کے لیے تیار نہیں تھا۔ لیکن ان کے بڑھتے ہوا اصرار کو دیکھتے ہوئے آمادہ ہونا ہی پڑا۔ امّی سے اجازت لیکر ہم روانہ ہوئے پارک میں گھوم پھر کر ذہن کسی حد تک فریش ہو گیا انور برابر میری برین واشنگ کرتے رہے۔ ''دیکھو فائزہ یہ دنیا ہے ہم برائی کے اس سیلاب کو نہ روک سکتے ہیں نہ اس کا سدِ باب ممکن ہے پھر جذباتی ہونا حماقت ہے۔ ''برائٹ اسٹار'' میں کھانا کھا کر واپسی کا سفر اختیار کیا۔ ذیلی سڑک سے نکل کر ہماری گاڑی جیسے ہی ہائی وے پر پہنچی سڑک پر بھیڑ دیکھ کر انور کو گاڑی روکنا پڑی۔ پولیس کی دو جیپیں بھی موجود تھیں لوگ مختلف بولیاں بول رہے تھے۔ انور صورت حال جاننے کے لیے گاڑی سے باہر نکلے۔ شاید کوئی بھیانک حادثہ رونما ہو گیا۔

''ارے یہ تو وہی پاگل تھی کنیز'' ایک آواز سماعت سے ٹکرائی۔ ''چلو اللہ نے مٹی عزیز کر لی'' میں اپنے کو روک نہ سکی اور گاڑی سے باہر آ گئی۔ پولیس بھیڑ کو منتشر کر رہی تھی۔ انور تیزی سے آتے دکھائی دیے انہوں نے گاڑی میں بیٹھ کر تفصیل سے آگاہ کیا۔

''پولیس ایک مجرم کا پیچھا کر رہی تھی جو بائک کو تیزی سے اُڑائے لیے جا رہا تھا۔ اچانک سامنے سے آتی پاگل عورت کو دیکھ کر اس نے بائک روک دی اور ''ماں'' کہہ کر اسکی طرف بڑھا تبھی پیچھے سے آئی پولیس کی گولی اسی کی پشت سے ٹکرائی وہ وہیں ڈھیر ہو گیا اس کی باہنوں میں پاگل ماں نے بھی دم توڑ دیا''۔

میں دم بخود سن رہی تھی۔ ذہن میں بگولے سے اٹھ رہے تھے۔ آخر تباہی کا یہ سیلاب کہاں رکے گا معاشرے کے بڑھتے جرائم کب ختم ہونگے ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے۔ قابلِ

تعریف یہ بات بھی ہے کہ جرائم کی دنیا میں بھی یہ سیکولرٹی قائم ہے ہر روز ٹی۔وی نیوز اور اخبار کی سرخیوں میں کتنے فراز، رام، اوتار، اور کرپال سنگھ ہیں جو مادرِ وطن کی جڑیں کھود رہے ہیں جن کی معصوم اور بے مائیں، ماتائیں، بی جیاں وقت کی دھول سے اَٹی برہنہ پا ہوش وخرد سے بیگانہ سڑکوں کی بھیڑ میں ہم آہنگ ہیں۔

کیا یہی ہے مہاتما گاندھی، ابوالکلام آزاد اور بھگت سنگھ کے خوابوں کا ہندوستان۔ کیا اسی کی آزادی کی قیمت ان جیالوں نے اپنی جان دیکر چکائی تھی؟ کیا اسی ہندوستان کے لیے ڈاکٹر اقبال نے کہا تھا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اسکی یہ گلستاں ہمارا

کہاں گئیں وہ بلبلیں؟ آج کا ہندوستان تو عقابوں اور گدھوں کی زد میں ہے عقاب زندہ شکار کرتا ہے اور گدھ مردہ لاشوں کو نوچ کر کھا رہے ہیں۔ خدایا اس معاشرے پر رحم فرما۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ نکلا۔

تماشائے اہل کرم

اداس شام دھیرے دھیرے رات کی سیاہی کا لبادہ اوڑھ رہی تھی۔ وہ تنہا اداسی کی چادر اوڑھے اپنے بستر پر لیٹی دھیرے دھیرے اپنے سینے کو دبا کر درد دور کرنے کی سعی ناکام کر رہی تھی۔ بستر کی چادر میلی تھی۔ تکیہ بھی چکٹ تھا۔ اردگرد کی چیزوں پر گرد کی دبیز تہہ تھی اس نے اپنی دھندلی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ اسکا ہمدم ہم ساز کمرہ جس کی چھت اور دیواروں نے کبھی اس کا اچھا وقت دیکھا تھا۔ اسے لگا اس کی دیواریں اس کے حال زار پر افسوس کر رہے ہوں۔ کبھی اس کے کھنکھناتے قہقہے اور چڑیوں کی کھنک کی مترنم آواز اس کمرے میں گونجا کرتی تھی۔ آج یہاں کھنڈروں کا سناٹا ہے مانو بدروحوں کا مسکن ہو۔ شاید اسی لیے گھر کے افراد یہاں آنا پسند نہیں کرتے تھے۔

اسے لگا اس کا سینہ ایک ایسا ریگستان ہو جس میں چاروں طرف صحرائی بگولے ہوں۔ تیز تند، وحشی اس کے پیر ریت سے اکھڑ گئے ہوں وہ فضا میں معلق ہو۔

دیر سے اسے چائے کے ایک کپ کی طلب تھی۔ ایک معمولی سا چائے کا کپ لیکن دل کسی ضدی بچے کی طرح مچل رہا تھا۔ اسے لگا وہ بھی ایک بچہ ہی ہے۔ شیکسپیر کے الفاظ میں بوڑھا بھی Second Child ہی ہوتا ہے۔ ضدی، اپنی بات منوانے والا۔ لیکن اس کی ضد پوری کرنے والا اس کی ماننے والا اس بھری دنیا میں شاید کوئی نہیں تھا۔

اچانک کمرے سے باہر آنے والی آوازوں نے اسکی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ ایک دوسرے سے گفتگو، برتنوں کی اٹھا پٹک، چائے کے برتنوں کی کھنکھناہٹ، سنک میں پانی گرنے کی آواز۔ ان سب کا مطلب تھا سب نے دن ڈھلے اپنے اپنے بستر چھوڑ دیے تھے۔ اور پیٹ کی پکار پر کچن میں نبرد آزما تھے یہ گھر دوپہر سے شام تک اداسی کی دبیز چادر میں لپٹا رہتا بلکہ اداسی تو اس کی اپنی لغت کا لفظ ہے۔ خاموشی اور سکون کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

دن ڈھلے زندگی جاگتی ہے۔ خاموشی کا سحر ٹوٹتا ہے۔ پتہ چلتا ہے اس گھر میں بھی انسان بستے ہیں۔ وہ توجہ سے کچن سے آتی آوازیں سننے لگی۔ اس کی بڑی بہو تند لہجہ میں اپنی بیٹی کو

ڈانٹ رہی تھی۔ چھوٹی بہو بڑی کی بات پر 'ص' لگا رہی تھی۔ وہ ابھی اس بات چیت کو سماعت میں جذب بھی نہ کر پائی تھی کہ کمرے میں پاؤں کی چاپ کے ساتھ 'چٹ' کی آواز آئی لیکن کمرہ روشن نہیں ہوا۔ ''اوہ شاید بلب فیوز ہو گیا دادی چائے پی لو میں موم بتی لاتی ہوں'' یہ اس کی پوتی آفرین تھی اس کی اندھیری زندگی میں اجالے کی ہلکی سی کرن۔

وہ بمشکل اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کپکپاتے ہاتھوں میں کپ تھاما اور کسی بے صبر ندیدے بچے کی طرح بڑے بڑے گھونٹ بھرنے لگی۔ چائے پھیکی تھی۔ شاید ماں کی بڑبڑاہٹ میں چینی ڈالنا بھول گئی تھی۔ اس نے دھیان ہی کہاں دیا۔ اسی دوران اس کی پوتی ایک موم بتی لے آئی۔ سائڈ ٹیبل پر موم بتی روشن کی اور کپ خالی ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ '' آفرین اگر دادی کی خدمت سے فرصت مل گئی ہو تو ذرا کچن میں جھانک لو'' یہ کرخت آواز اس کی بہو یعنی آفرین کی ماں کی تھی۔ چائے کا ایک کپ پی کر اس کے حواس کچھ قابو میں آئے۔ سینے کے درد میں کمی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے چکٹ تکیہ پر نظر ڈالی عجیب سی مہک آ رہی تھی۔ سرہانے سے تولیہ اٹھا کر تکیہ پر ڈالا کروٹ کے بل لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی دور تک اندھیرا پھیل گیا۔

اچانک اندھیرے میں روشنی کا جھماکا ہوا۔ وہ آنکھیں کھولے یا یوں ہی بند رکھے۔ وہ ابھی سوچ بھی نہ پائی تھی کہ محسوس ہوا وہ تیز قدموں سے پیچھے کی طرف بھاگ رہی ہو۔ پیچھے اور پیچھے۔

دنوں، ہفتوں، مہینوں اور سالوں کی دھند سے گذرتے ہوئے وہ ایک وسیع اور شاندار مکان میں کھڑی ہو گئی۔ سامنے ایک گوری چٹی روشن آنکھوں اور گھونگر والے بالوں والی بچی پنک فراک میں ملبوس کسی بات کے لیے ضد کر رہی ہے۔ شفیق باپ اپنے ساتھ لگا کر اس کی پیشانی چومتا ہے اور کچھ سمجھاتا ہے بچی بہل جاتی ہے۔

وہ اور آگے بڑھتی ہے ایک حسین دوشیزہ ایک نوجوان سے کچھ کہہ رہی ہے نوجوان اس کا کزن ہی نہیں بلکہ بہت کچھ ہے ایک ہفتہ قبل وہ نکاح کے مقدس بندھن میں بندھے ہیں۔ وہ سننے لگتی ہے۔

''شیراز کیوں اتنی دور جا رہے ہو؟'' ''سنہری مستقبل کے لیے اور کیوں''؟ دوسری آواز۔

''اپنے ملک میں کیا نہیں ہے جو امریکہ سے خریدنا چاہتے ہو''۔ ڈالر جو ہماری آنے

والی زندگی میں خوشحالی روشنی اور عیش لائیں گے''۔نوجوان کا جواب تھا۔

''کیا جو لوگ امریکہ نہیں جاتے انہیں یہ چیزیں میسّر نہیں ہیں۔اور سچی خوشی سے تو ڈالر کے ملک کا صدر بھی محروم ہے۔وہ ساری دنیا کو اپنے زیرنگیں دیکھنے اور ایک دوسرے سے لڑانے کی فکر میں خود ہی راتوں کی نیند کھو بیٹھا ہے۔''یہ تو سوچو میں تمھارے بغیر کیسے جیونگی''۔

''بھئی ابھی تو رخصتی میں ایک سال باقی ہے۔ایک سال بعد تم بھی میرے ساتھ ہوگی''۔نوجوان نے تسلی دی۔

کچھ اور آگے...... ہر طرف آہ و بکا کا طوفان ہے۔جس جہاز سے شیراز سنہرے مستقبل کی آرزو لیے جا رہا تھا وہ کریش ہو گیا۔لڑکی سہاگن بننے سے پہلے بیوہ ہو گئی۔کنواری، ان چھوئی بیوہ، زندگی اس سے بچھڑ گئی۔اس کے ارمان، آرزوئیں اس کی چاہت سب آنسوؤں کا طوفان بہا کر لے گیا۔

وقت بڑا ہی بے رحم ہے خود ہی زخم دیتا ہے اور پھر اس پر مرہم بھی خود ہی لگاتا ہے۔لڑکی نے اپنے آپ کو وقت کے تیز دھارے پر بہنے کے لیے چھوڑ دیا۔ایک اور نوجوان آگے آتا ہے اس کی ٹوٹی پھوٹی بے رنگ زندگی کو سمیٹ کر ایک انجانی راہ کی طرف چل پڑتا ہے وہ رشتوں کے حصار میں گھر جاتی ہے۔پہلے شوہر، ساس، سسر اور پھر بچے۔ہر طرف فرض کی پکار۔بوڑھے کمزور ساس سسر کی خدمت فرض، مجازی خدا کو خوش رکھنا فرض، بچوں کی پرورش فرض غرض ہر طرف فرض کی گردان۔وہ ایک فرض شناس بیوی، بہو اور ماں بن جاتی ہے۔اس نے بھولے سے بھی پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا کہ اب زندگی اس کی رہی کہاں؟ اس پر تو اسکے شوہر بچوں کا حق ہے۔زندگی یکساں رفتار سے چلتی رہی۔قدرت نے اسے ایک بیٹی اور دو بیٹوں سے نوازا۔شوہر کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔بیٹی بیاہ کر ملک سے باہر چلی گئی۔اب وہ اپنے بیٹوں کو دیکھ دیکھ کر جیتی۔بیٹے اس کے بڑھاپے کا سہارا اس کے دل کا چین۔تلاش بسیار کے بعد وہ بڑے چاؤ سے بہوئیں لے آئی اور جی جان سے ان کی ناز برداری میں لگ گئی۔وہ کام کرنا چاہتیں وہ پیار اور سہولت سے منع کر دیتی ابھی ان کے عیش کرنے گھومنے پھرنے کے دِن ہیں۔ان دنوں گھر کا ماحول کتنا اچھا تھا وہ بہترین کھانے پکاتی سب چٹخارے لے کر کھاتے اور تعریف کرتے یہ سوچے بنا کہ یہ ہاتھ اب کتنے کمزور ہوتے جا

رہے ہیں۔اپنی تعریف سن کراس کا سینہ فخر سے پھول جاتا۔اپنے بچوں کی خدمت کا بھی ایک الگ لطف ہے یہ کوئی ماں کے دل سے پوچھے۔

آہستہ آہستہ وہ تھکنے لگی زندگی کے دروازے پر بڑھاپا دستک دینے لگا۔اس کی بوڑھی ہڈیوں میں پہلا جیسادم باقی نہ رہا۔وہ کام سے ہاتھ کھینچنے لگی۔بڑھاپا تو ویسے بھی اپنے جلو میں ہزاروں بیماریاں لیکرآتا ہے۔بہوؤں کا التفات کم ہونے لگا۔بیٹے ڈالراور ریال کمانے دوسرے ملکوں میں چلے گئے۔ان کی جدائی کا احساس دل کی جڑوں کو کاٹتا روح کی گہرائی میں جاگزیں ہو گیا۔وقت اپنی منحوس چال سے چلتا رہااور نوبت یہاں تک پہنچی وہ ہڈیوں کا پنجر بن کر بستر تک محدود ہوگئی۔

وہ جو حوادث سے لڑی تھی جذبوں کی جنگ جیتی تھی ضبط کی منزلوں سے گزری تھی جو اپنے کو بہت مضبوط اعصاب کی عورت تصور کرتی تھی۔

وہ کوئی آواز تھی جس نے اسے ماضی کے حال میں کھینچ لیا تھا۔

''والدین کی خدمت اوران سے حسن سلوک عبارت خداوندی کے بعداہم فریضہ ہے، ماں کی خدمت جنت کی کنجی ہےاس کے پیروں کے نیچےاولاد کی جنت ہے'' یہ آواز ٹی۔وی کے اسلامک چینل سے آرہی تھی۔

اسے بے ساختہ ہنسی آگئی ایسی ہنسی جس میں زہر بھری تلخی تھی جیسے اس کی روح بین کر رہی ہو۔فرض ،فرض ،فرض کھوکھلا بے معنی ،غیر مانوس لفظ۔شاید اس گھر کے لوگوں کی اس سے شناسائی ہی نہیں ہے۔اس کے بیٹوں کے فون آتے ''اماں ٹھیک ہیں؟ کہہ کروہ اپنے فرض سے ادا ہوجاتے اچانک ایک خوش کن آوازاس کے کان میں پڑی یہ اس کی پوتی آفرین کی تھی۔

''ممی جلدی آیئے پاپا کا فون ہے''۔اس کے کمزور وجود میں خوشی کی لہریں دوڑنے لگیں۔اس کا رواں راواں سماعت بن گیا۔کیاوہ اپنے بچے کی آوازسن پائیگی؟ یہ خواہش ہر مرتبہ فون آنے پر اس کے دل میں پیدا ہوتی ہےاوراپنی موت آپ مرجاتی ہے۔اسے بہو کا جواب یادآیا'' آپ بات کر کے کیا کرینگی ہم نے کہہ دیا ٹھیک ٹھاک ہیں خوامخواہ پیسوں کا خرچ''۔

لمحے سیکنڈوں اور منٹوں میں بدل کرآگے بڑھے۔مختلف آوازیں۔''ممی یہ کیسے ممکن

ہے دادی کو تکلیف ہوگی'' یہ آواز آفرین کی تھی۔ ''لو اس میں تکلیف کی کون سی بات ہے آخر حرج ہی کیا ہے'' یہ جملہ چھوٹی بہو نے ادا کیا۔ یہ فیصلہ تیرے باوا کا ہے ان کے ساتھ کوئی دوست آ رہے ہیں ان کے لیے کمرہ سیٹ کر دیا جائے گا''۔

''دادی کے کمرے پر ہی کیا منحصر ہے۔ آخر چچی کے پاس بھی تو کئی کمرے ہیں ان میں سے ایک سیٹ کر دیجئے''۔ مجھے تو بخشو بی بی ایک کمرے میں تو بچے لکھتے پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے میں میری سہیلیاں وغیرہ بیٹھتی ہیں''۔ چھوٹی بہو آفرین سے الجھیں۔ ''آخر پھر دادی کہاں رہیں گی'' آفرین اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔

''دادی کی چمچی بے فکر رہو انہیں ہم کھلے میدان میں نہیں ڈالینگے پیچھے کی طرف اچھا خاصا کمرہ ہے'' بڑی بہو نے گل افشانی کی۔

''کچھ تو خیال کریں ممی دادی اس کمرے میں کیسے رہیں گی اس کو تو کمرہ کہنا ہی غلط ہے۔ عہد و بابا پتہ نہیں کس طرح رہتے تھے اس کوٹھری میں''۔

''بھئی ان اکیلی جان کا ہے ہی کیا۔ ایک چارپائی ہی تو پڑنا ہے''۔ چھوٹی بہو بولے بنا نہ رہ سکیں۔ اس نے سب آوازیں اپنے کانوں سے سنیں کچھ دیر پہلے کی خوشی مانو بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہوگئی ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کے خشک ہونٹوں پر زخموں کی طرح نمودار ہوئی۔ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ زنگ آلود برتن، کانچ کی چٹخی ہوئی کراکری، یا ٹوٹا ہوا فرنیچر جو نا قابلِ استعمال ہونے پر ایک طرف ڈال دیا جاتا ہے۔

کبھی اس کی دھندلی آنکھوں میں روشنی تھی اس نے ساس بہو کے تعالقات پر کتنی فلمیں دیکھیں اور کتنی کہانیاں پڑھیں ساس بہو کے تعلقات اور بہوؤں کی مظلومیت اور ستم رسیدگی پر قلم کار حضرات اور خواتین نے بہت کچھ لکھا اور ساس کو کچھ ایسا ظالم بے رحم اور سنگ دل ثابت کرنے کی کوشش کی گویا وہ ایک خوں آشام چڑیل ہو جس کے آگے کو نکلے دانت بہو کا خون بہانے کو ہر آن تیار رہتے ہوں سر پر نکلے سینگ جس کو وہ بے دریغ استعمال کرتی ہو۔ اسی وقت وہ اُن کہانیوں کو محض تفنن طبع کے طور پر پڑھتی تھی لیکن اب وہ ان سب قلم کاروں سے شاکی تھی جنھوں نے تصویر کا ایک ہی رُخ پیش کر کے حقیقت سے آنکھیں بند کر لی تھیں ایک کہانی کار معاشرے کا ہی ایک فرد

ہوتا ہے اس کی جو خوبی اس کو عام لوگوں سے الگ کرتی ہے وہ ہے زبردست قوت مشاہدہ اور احساس کی دولت۔ وہ اپنی کہانی کے تانے بانے اپنے اردگرد کے تلخ و شیریں حالات سے ہی بنتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض گھروں میں بہوئیں ظلم کا شکار ہیں لیکن ایسے گھروں کی بھی کمی نہیں جہاں ساس عبرت کی تصویر بنی گھر کے سب سے چھوٹے اور ناکارہ کمرے میں لمحہ لمحہ موت کا انتظار کر رہی ہے۔

ایک ماں اپنے بیٹے کو پیدائش سے لے کر ایک جوان اور توانا مرد بنانے تک اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیتی ہے۔ تن، من، دھن وار دیتی ہے کہ اس کا بچہ بڑا ہو کر اس کا سہارا بنے گا لیکن اکثر اس کی جانفشانی کا کل فائدہ بہو کے حق میں جاتا ہے۔ وقت کے قدموں کی روندی ہوئی بوڑھی کمزور ماں شاخ سے ٹوٹے ہوئے سوکھے پتے کی مانند ہوتی ہے۔ جس کے نصیب میں اپنوں کی ٹھوکریں ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں خون کے رشتے نفع نقصان سے بالاتر ہوتے ہیں۔ بوڑھے اور ناکارہ والدین کا بوجھ جب انکی اپنی اولاد نہیں اٹھا سکتی تو دوسروں کو کیا پڑی ہے جو ہمدردی کرنے آگے آئے گا اور دلجوئی کریگا۔

بہت سے قلم کاروں نے گھر کی بزرگ ہستی کو چار چاند لگا کر بھی پیش کیا ہے۔ امی حضور، اماں جان دادی حضور پھول دادی جیسے خطابوں سے نوازنے کے علاوہ گھر کے بچوں کی تقدیروں کے فیصلے بھی ان سے کرائے ہیں۔ معلوم نہیں یہ ان کے تخلیات کی کارفرمائیاں ہیں یا حقیقت میں وہ خوش نصیب ہستیاں اس روئے زمین پر ہیں۔

کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ آج کی بہو جو ساس کو ایک ناگوار بوجھ تصور کرتی ہے یہ بھول جاتی بھول جاتی ہے کہ کل اسے بھی اس پلیٹ فارم پر کھڑا ہونا ہے۔ ببول بو کر گلابوں کی امید رکھنا حماقت ہے۔ اسلام وہ واحد مذہب ہے جس میں والدین سے حسن سلوک انکا ادب و احترام ایک مذہبی فریضے کے طور پر پیش کیا ہے۔ اگر معاشرے کے اس زخم کی طرف توجہ نہیں دی گئی تو وہ دن دور نہیں جب مغربی ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی بوڑھے والدین کے لیے فلاحی اور خیراتی ادارے پناہ گاہ ثابت ہونگے۔ غور کیجئے اور انصاف کیجئے۔

تقدیر کا تماشا

نام تو ان کا شمس الرحمٰن تھا لیکن بھلا ہو اماں کے لاڈ پیار کا شمو شمو کر دیا۔ آج کے دور کی ہوتیں تو sun کی مناسبت سے سنی کہہ دیتیں۔ بات دراصل یوں ہے کہ دو بیٹوں کے بعد ترس ترس کر نفیسہ بیگم کی گود میں آئے تھے۔ نفیسہ بیگم اچھی خاصی گوری چٹی تھیں نازیہ اور شازیہ بھی ماں پر پڑی تھیں۔ لیکن شمس الرحمن عرف شمو اچھی خاصی سیاہ رنگت کے تھے نقشہ بھی کچھ یونہی سا تھا البتہ آنکھیں چھوٹی ہونے کے باوجود اس طرح چمکتی تھیں جیسے اندھیرے میں بلی کی آنکھیں سو کھے مریل بہت سی بیماریوں کا پٹارہ ساتھ لیکر آئے تھے۔ لیکن نفیسہ بیگم کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ ''شمو میرا چاند دل کی ٹھنڈک ان کے ڈائیلاگ ہوتے۔ ویسے ہر ماں کو اپنا بچہ چاند جیسا ہی نظر آتا ہے یہ الگ بات تھی کہ ان کا چاند اپنے بیشمار داغوں کے ساتھ گہنایا ہوا بھی تھا۔ بات یوں تھی کہ بچپن میں دوبارہ ان پر چیچک کا حملہ ہوا اور وہ جاتے جاتے ان کے چہرے کو نقشین کر گئی۔ لیکن ماں خوشی سے بے حال کچھ بھی ہوا ہے تو مرد بچہ۔ خیر اللہ کی بنائی صورت پر اعتراض کیسا۔ پڑھنے لکھنے کی عمر آئی ماں نے بڑے چاؤ سے اسکول بھیجا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ نتیجہ صفر رہا۔ کند ذہن اور بدشوق شروع سے تھے۔ ماں خوشامد کر کرا کر اسکول بھیجتی وہ دن گنوا کر اس طرح تھکے ماندے واپس آتے گویا ٹیچر نے بجائے پڑھانے کے پتھروں کی سلیں ڈھلوائی ہوں۔ آٹھویں میں دو دفعہ فیل ہو کر اسکول پر فاتحہ پڑھ لی گئی اور باپ کے ساتھ جنرل اسٹور پر بیٹھنے لگے جو ترقی کے مدارج طے کر کے سپر اسٹور میں تبدیل ہو گیا۔ اب تو اس بات کو کئی سال بیت گئے۔ ان سے چھوٹی ضویا کا بی۔ اے کا آخری سال تھا گو نفیسہ بیگم بیٹوں کی پڑھائی کے حق میں نہیں تھیں۔ لیکن اکرم صاحب نے ہمیشہ لڑکیوں کی سائڈ لی۔ انہیں کی کوششوں کے نتیجے میں نازیہ اور شازیہ نے بھی بی۔ اے کر لیا۔ شکل وصورت کی اچھی تھیں جلد ہی دونوں اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں اب ضویا کی شادی کا مسئلہ باقی تھا۔ اکرم صاحب چاہتے تھے وہ بھی اپنے گھر کی ہو جائے لیکن نفیسہ بیگم اُڑ گئیں جب تک شمو کی شادی نہیں ہو جاتی ضویا کی نہیں کرونگی۔ لیکن شمو کی شادی ہونا غالباً دنیا کا سب سے مشکل مسئلہ

بن گیا تھا۔ ماں کے الفاظ تھے دیکھنا چاندسی دلھن لیکر آؤنگی ۔ کہنے والے دلی زبان میں کچھ سمجھاتے لیکن نفیسہ بیگم ہاتھ نچا کرکہتی ۔

''اے مرد کی صورت کون دیکھتا ہے جیب کا وزن دیکھا جاتا ہے''۔ انہیں اپنے رنگ روپ پر ناز تھا۔ آخران کے اماں ابا نے تو رنگ دیکھے بنا انکی شادی کردی اب یہ کون سمجھاتا کہ اکرم صاحب میں رنگ کے علاوہ کوئی کمی نہیں تھی پڑھے لکھے مہذب جامہ زیب انسان تھے سرگرمی سے چاندسی دلھن کی تلاش جاری تھی لیکن وہ نہ معلوم کون سی بدلی میں قید تھی کہ تلاش بسار کے بعد بھی معاملہ روزِ اول جیسا تھا۔ چاندسی تو دور کی بات کوئی سانولی سلونی بھی ہاتھ آ کر نہیں دے رہی تھی۔ دوایک جگہ کچھ امید بندھی بھی لیکن جلد ہی کوئی لڑکے کو دیکھنے آیا اور بات ختم نازیہ شازیہ بھی ان چکروں سے تھک گئی تھیں نفیسہ بیگم حیران تھیں کہ آخر معاملہ کیا ہے کہ جہاں بھر کی شادیاں ہورہی ہیں روز ہی شہر کے شادی ہال بک ہوتے ہیں انکے شمو کو کوئی کیوں نہیں جڑتی۔ شاید وہ یہ بھول گئیں تھیں کہ آج کے دور کی لڑکیاں پرانے زمانے کی اللہ میاں کی گائیں نہیں ہیں کہ والدین نے بغیر رنگ روپ، عمر، تعلیم دیکھے بنا جس کھونٹے سے چاہا باندھ دیا۔ جب کہ یہ مذہبی اعتبار سے بھی غلط ہے۔

آج پھر رشتہ کرنے والی چھمن بوا کے ساتھ وہ کہیں جانے والی تھیں شازیہ نازیہ کو بھی بلوالیا گیا دل میں ہزاروں ارمان لیے وہ لڑکی کے گھر میں پہنچی۔ لڑکی واقعی ان کے خوابوں اور خیالوں سے بڑھ کرتھی آؤ بھگت بھی اچھی ہوئی اور کیوں نہ ہوتی سپر اسٹور کا مالک، اکلوتا بیٹا، بہنیں اپنے گھروں کی جلد ہی چھوٹی کی بھی شادی ہوجائے گی لڑکی راج کرےگی۔ آج کل تو ویسے بھی یہ لڑکی والوں کی بڑی خواہش ہوتی ہے کہ لڑکا اکیلا ہو بہن بھائی کے دم چھلے سے پاک والدین بھی اگر انتقال فرما گئے ہوں تو کہنا ہی کیا اور اگر والدین شروع سے ہوتے ہی نہیں، آسمان سے گر کر کسی کھجور میں اٹک جاتے تو انکی بیٹی کا نصیب مہر و ماہ کی طرح چمکتا۔ خیر تو ذکر ہے شمس الرحمٰن کی شادی کا۔ دو ہی روز گزرنے پائے تھے کہ چھمن بوا ہانپتی کانپتی آحاضر ہوئیں ''میں نہ کہتی تھی بی بی صاحبزادے بڑے بھاگوان ہیں وہ سب کی سب آرہی ہیں''۔

''کون سب کی سب''۔ ''ارے وہی جہاں آپ پرسوں گئیں تھیں'' ''اچھا کیا رشتہ منظور کرلیا'' ''اے بی بی کی باتیں اگر منظور نہ ہوتا تو آتیں کیوں''۔ نفیسہ بیگم ایسی خوش تھیں گویا چاند

کی سرزمین سے واپس آ کر عالمی رکارڈ بنایا ہے۔

''اے ضویا کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہے جلدی سے چھمن بوا کے لیے ایک کپ چائے لاؤ ساتھ میں کچھ میٹھا بھی لانا''۔انہوں نے پاس کھڑی بیٹی کو مخاطب کیا۔''اے ہاں آئیں گی کب''۔ساتھ ہی بوا سے معلوم کیا۔''آج ہی شام کو''۔

نفیسہ بیگم پر بدحواسی سوار ہوگئی۔جلدی سے دونوں بیٹیوں کو فون کیا۔ضویا کے بھی ہاتھ پیر پھلائے''بوا کون کون آ رہا ہے''۔''بی بی خیر سے لڑکی کی ماں، چاروں بہنیں، تینوں بھاوجیں، تینوں چاچیاں، دونوں خالائیں اور انکی لڑکیاں۔''بھلا اتنی عورتوں کے آنے کی کیا تک ہے یہاں سے تو اماں کے ساتھ صرف باجی اور اپیا گئیں تھیں''۔ضویا بولے بنا نہ رہ سکی''اے تو چپ کر جم جم آئیں۔نفیسہ بیگم نے ڈانٹا۔

اکرم صاحب نے آکر سنا تو عورتوں کی تعداد پر انہیں بھی اعتراض ہوا۔لیکن نفیسہ بیگم حواسوں میں کب تھیں جو کچھ غور فرماتیں جلدی سے بولیں۔''اب تم اڑنگا نہ لگاؤ اللہ اللہ کر کے یہ دن دیکھا ہے تم ناشتے کا انتظار کرو۔مٹھائی پھل سب بڑھیا اور تازے ہوں''۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں خوشی کی کیا بات ہے کیا اب الٹا دستور ہو گیا ہے لڑکے کو انگوٹھی پہنانے آ رہی ہیں۔''اکرم صاحب نے کہا۔

''اے ہٹو تمھاری باتیں سٹھیا گئے ہو اور سنو تم گھر ہی میں رہنا۔''

''کیوں کیا مجھے دیکھنے آ رہی ہیں تم نے میرے لیے بھی کوئی لڑکی وڑکی پسند کر لی''۔

''اے لو میرا لال آ گیا شمو کو دیکھ کر انہوں نے میاں کو کرارا سا جواب دینے کا ارادہ ترک کر دیا۔

اور بیٹے کو تیاری کی ہدایت دینے لگیں۔اتنے میں گیٹ سے اکرم صاحب کا خوبرو بلند قامت بھانجا داخل ہوا۔''ممانی کوئی تقریب ہے کیا''۔سلام دعا کے تبادلے کے بعد ندیم نے دریافت کیا۔وہ اور ضویا ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اس کا چونکنا فطری تھا۔''بیٹا بڑے اچھے وقت پر آئے شمو کے سسرالی آ رہے ہیں تم یہ سب سامان لے آؤ تمھارے ماموں کو تو کوئی چیز لینے کا ڈھنگ ہے ہی نہیں ممانی نے ایک طویل لسٹ ندیم کو دیتے ہوئے کہا۔''کیا شمو بھائی کا رشتہ پکا ہو

گیا۔‘‘ ’’اے ابھی کہاں وہاں سے کچھ عورتیں آ رہی ہیں‘‘۔ ممانی نے ندیم کو جواب دیا۔ کچھ نہیں بہت کچھ لڑکی کی بہنیں، بھاوجیں، خالائیں، چاچیاں اور اگر زندہ ہوئیں تو نانی دادی بھی‘‘ اکرم صاحب نے سوکھے منہ سے کہا ندیم بے اختیار ہنس پڑا۔ لائے ممانی پیسے دیجیے اس کا شک دور ہو چکا تھا زندہ دل لوٹ آئی تھی وقت مقررہ پر بیس پچیس عورتوں کا قافلہ چھاپہ مار دستہ کر طرح نفیسہ بیگم کے آنگن میں اترا وہ کچھ اس طرح الرٹ تھیں جس طرح کوئی معمولی فوجی جنرل کے سامنے ہوتا ہے۔ بوڑھی ادھیڑ، شادی شدہ، الھڑ کنواریاں غرض ہر سیمپل موجود تھا۔ اتنے میں ندیم لدے پھندے حاضر ہوئے ندیم کا آنا تھا کہ خواتین میں ہلچل سی مچ گئی نامزد لڑکی کی ماں کا چہرہ کھل اٹھا۔ جبکہ دوسری لڑکیوں کے چہروں پر پسندیدگی کے ساتھ ساتھ حسرت دیاس کے ڈونگرے برسنے لگے۔ فضا خود بخود خوشگوار ہو گئی۔ ادھر نفیسہ بیگم کھلی جا رہی تھیں۔ چاندی دلھن ذہن کے اسکرین پر چھم چھم کر رہی تھی۔ ناشتہ کے ساتھ بھی انصاف کیا گیا۔ ادھر شمس الرحمٰن واش روم میں صابن کے ساتھ ایسے بزد آزما تھے کہ لگتا تھا صابن اور پانی کے ساتھ خود بھی نہ بہہ جائیں۔ نفیسہ بیگم اس جم غفیر میں اصل مسئلہ یعنی شمسی صاحب کا دیدار کرانا بھول چکی تھیں۔ ’’اچھا بہن اب ہمیں اجازت دیجیے اور ہماری طرف سے رشتہ پکا سمجھیے‘‘۔ لڑکی کی ماں کا کہنا تھا کہ نفیسہ بیگم پھول کر کپا ہو گئیں۔ ادھر شمس صاحب واش روم کا گناہ معاف کر کے کپڑوں کے انتخاب میں مشغول تھے۔ ’’پینٹ شرٹ پہنوں یا شلوار سوٹ۔ آسمانی کلر کا شلوار سوٹ زیب بدن کیا اور ڈریسنگ کے سامنے جم گئے بالوں کے کئی اسٹائل بدلے۔ سرمہ بھی لگا لینا چاہیے آنکھیں کچھ بڑی لگیں گی۔ خدا خدا کر کے نک سک سے تیار ہو کر ایک کرسی پر جم گئے۔ ہر آہٹ پر دھیان کہ اماں کب بلاتی ہیں۔ ’’ارے شمو بھائی کدھر ہیں‘‘۔ ندیم کی آواز کان میں پڑی۔

’’آپ اکیلے کمرے میں کیا کر رہے ہیں‘‘۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ’’بغیر بلائے باہر کیسے جا سکتا تھا‘‘۔ شرمیلی مسکراہٹ سے جواب ملا۔ کیوں؟۔ ’’وہ خواتین وغیرہ‘‘۔ ارے واہ ندیم نے قہقہ لگا کر کہا۔ آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہو گیا۔ ’’کیا مطلب کیا آنے والیاں چلی گئیں اماں نے تو کہا تھا مجھے دیکھنے آ رہی ہیں‘‘۔ انہیں اپنی ساری تیاری بے مزہ معلوم ہونے لگی۔ ’’رشتہ کی منظوری دے گئی ہیں۔‘‘ ندیم نے مژدہ سنایا سوکھے دھانوں میں پانی پڑ

گیا۔ وہ ندیم کے ساتھ باہر آکر بیٹھ گئے۔ اکرم صاحب بھی بیرونی کمرے سے رہائی پا چکے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی نفیسہ بیگم شروع ہوگئیں"۔ دیکھا اپنے میں نہ کہتی تھی شمو کی چاندسی دلھن لاؤنگی۔ اللہ نے کیسی مراد پوری کی منگنی بھی ایسی دھوم دھام سے کرونگی سینوں پر سانپ لوٹینگے جو کہتے تھے پہلے بیٹے کی صورت تو دیکھو کلیجہ خاک کر دیا ان خاندان والوں نے اکرم صاحب نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا وہ کسی گہری سوچ میں تھے۔" اے کیا سوچ رہے ہو" انہیں خاموش دیکھ کر وہ گویا ہوئیں۔

"وہ سوچ رہا ہوں جو تم نہیں سوچ رہی ہو"۔ کیا؟ اتنی مخلوق اکٹھی ہو کر لڑکے کو دیکھنے آئی تھی اور بغیر دیکھے ہی رضامندی دیدی یہ کیا تک تھی۔" پاپا میں بھی یہ سوچ رہی ہوں شمو بھائی تو سامنے آئے ہی نہیں"۔ ضویا نے سوچ کو الفاظ دیے۔

"کہیں ندیم بھائی کو دیکھ کر تو ہاں نہیں کہہ گئیں"۔ شازیہ نے کہا۔" اے کیوں بدقولی کر تی ہو انہوں نے بیٹیوں پر ایک قہر آلود نظر ڈالی۔" جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں"۔ مزید فرمایا گیا "جوڑے ضرور آسمانوں پر بنتے ہیں لیکن اللہ کی بندی شازیہ کی بات میں وزن ہے کیا وہ صرف ناشتہ کرنے آئی تھیں"۔ اکرم صاحب نے تدبر سے کہا۔

"اے ہاں کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہو"۔ نفیسہ بیگم کے دل کو شوہر کی بات لگی۔" اب کیا کیا جائے" کرنا کیا ہے۔ تم کل جا کر معلوم کرو کہ لڑکے کو دیکھے بنا انہوں نے منظوری کیسے دی جانتی ہو غلط فہمی کے بعض دفعہ بہت سنگین نتائج نکلتے ہیں۔ دوسری صبح ناشتہ سے فارغ ہوتے ہی نفیسہ بیگم چھمن بوا کی ہمراہی میں لڑکی والوں کے گھر روانہ ہوگئیں۔ بغیر کہے سنے نفیسہ بیگم کی آمد کو سب ہی نے حیرت سے دیکھا یہ اور بات کہ حیرت ظاہر نہ ہونے دی۔ اِدھر اُدھر کی چند رسمی باتوں کے بعد نفیسہ بیگم اصل بات پر آگئیں۔

"بہن آپ نے ناحق تکلیف کی ہم نے تو کل ہی منظوری دے دی ہے"۔ لڑکی کی والدہ نے کہا" یہی تو معلوم کرنے آئی ہوں کہ بغیر لڑکے کو دیکھے آپ نے کیسے رشتہ منظور کرلیا۔

"اے بہن دیکھا کیوں نہیں ماشاءاللہ ہماری بچی کا جوڑ ہے" لڑکی کی چاچی نے مسکرا کر کہا۔ نفیسہ بیگم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہیں۔ چھمن بوا مدد کو آگے آئیں۔" اے بیوی صاحبزادے سامنے ہی کب آئے"

''تو وہ جو نیلی جینز اور لائنگ کی شرٹ میں تھے''۔لڑکی کی بھابی نے کہا۔

''وہ تو میری نند کا بیٹا ہے''۔نفیسہ بیگم نے مری ہوئی آواز میں کہا اور میاں کی نصیحت یاد آنے پر جلدی سے پرس کھول کر شمو میاں کا فوٹو نکالا۔فوٹو دیکھنے کو متعدد سر جھکے پھر سر اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔''یہ میری بیٹی کا جوڑ نہیں ہے''۔لڑکی کی ماں نے کہا''۔''کیوں کیا کمی ہے اس میں''۔نفیسہ بیگم کو تراره آگیا۔''کوئی کمی نہیں ہے لیکن ان کے لیے ہماری طرف سے انکار ہے''۔ پھر کل منظوری دیکر کیوں آئی تھیں''۔ بتا تو دیا ہم اس نوجوان کو آپ کا بیٹا سمجھے''۔نفیسہ بیگم آسانی سے ہارنے والوں میں سے نہیں تھیں۔''کیسے شریف لوگ ہو زبان دیکر مکر تے ہو''۔غصہ سے بولیں۔''اور آپ کیسی شریف ہیں جو دوسرے خوبصورت لڑکے کو دکھا کر بدصورت بیٹے کے لیے ہاں کرواتی ہیں''۔لڑکی کی بھابی نے کہا جو صورت ہی سے کافی تیز نظر آتی تھی۔پھر کیا تھا نفیسہ بیگم خم ٹھونک کر میدان میں آگئیں۔اور روانگی تک...... ''آپ سے تم ہوئے پھر تو کا عنواں ہو گئے پر معاملہ ٹلا۔

گھر آکر سوگوار کیفیت میں ایک طرف ڈھے گئیں۔''کیا ہوا اماں''۔ضویا پانی کا گلاس لیکر ماں کے پاس آئی''ہونا کیا تھا یہ سب ان کی کم عقلی کا نتیجہ ہے''۔اکرم صاحب نے معاملے کو بھانپ کر کہا۔''ہاں اب تم بھی مجھی کو کہنا''

''اے دفعہ کرو مٹی ڈالو دنیا ان کی بیٹی پر ختم تھوڑی ہو گئی ہے''مزید جز کر بولیں''۔
مستقبل کی چاندسی دلہن سے مایوس ہو کر شمو نے منہ لٹکا کر باہر کی راہ پکڑی۔گلی کے موڑ تک ہی پہنچے تھے کہ سامنے سے آتے رکشا پر نظر پڑی سیاہ ریشمی برقعے سے سفید چہرہ جھانک رہا ہے۔پھر وہی بدلی کا چاند برابر میں سفید برقع میں ملبوس ایک ضعیفہ تھیں۔شمو نظر باز تو ہرگز نہیں تھے بس ویسے ہی نظریں اٹھ گئیں اب خدا جانے ان کی نظر کی تاثیر تھی، یا رکشے والے کی لاپرواہی یا پھر سڑک کے گڈھے کا قصور کے رکشا الٹ گیا۔''ہائے اللہ مر گئی''۔ضعیفہ نے دلدوز چیخ ماری۔شمو جلدی سے آگے بڑھے۔لڑکی تو اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بڑی بی کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگی شمو نے بڑی بی کو اٹھا یا پیر کی چوٹ کے باعث وہ سیدھی کھڑی نہ ہو سکیں۔لڑکی رونے کے قریب تھی شمو نے غور سے دیکھا حقیقت میں اس کا چہرہ بدلی کے چاند کی طرح ضیاپاشی کر رہا تھا۔شمو کو بے اختیار اماں یاد آگئیں۔

''آپ گھبرایئے نہیں میں جو ہوں''۔ کہہ کر وہ دونوں کولیکر قریبی کلینک پہنچے۔ ڈاکٹر نے دیکھا بھالا دوائیں لکھیں بڑی محفوظ تھی۔ ڈاکٹر کی فیس کے ساتھ دوائیں خریدی گئیں۔ لڑکی نے پرس نکالا۔

ارے رہنے دیجئے گھر جا کر لے لونگا۔ (گھر تک جانے کی راہ سوجھی) دونوں کولیکر گھر آئے۔ دروازے سے لوٹنے کو دل کس کافر کا چاہ رہا تھا دکھا دے کو جانے کی اجازت مانگی۔ ''اے بیٹا اندر آؤ تم تو رحمت کا فرشتہ ہو'' بڑی بی کے الفاظ کے ساتھ ''اندر آیئے'' کا گھنگرو بجا۔ شمو کو لگا چاروں طرف پھول کھل گئے ہوں۔ ایک کمرے نیچے سے برآمد سے تنگ صحن کا چھوٹا سا کچا پکا مکان تھا۔ وہ برآمدے میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ''شمی جلدی سے چائے لاؤ'' بڑی بی نے کمرے کی طرف منہ کر کے کہا۔ ''واہ کیا نام ہے شمی، شمو، شمی فقط آخر حرف کا فرق''۔ وہ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ شمی جو برقع کی قید سے آزاد ہو چکی تھیں سامنے آئیں اور شمو بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔ ''کیا آپ دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے''۔

''کہاں بیٹا بس ہم دو ماں بیٹی ہی ہیں''۔ بڑی بی نے سرد آہ کھینچی۔ ''اور بیٹا وغیرہ''۔ ایسے نصیب کہاں بچی کو ساتھ لیکر سودا سلف لینے گئی تھی یہ افتاد ٹوٹ پڑی تم جانو رزمانہ خراب ہے۔ اکیلی لڑکی کو بازار بھیج نہیں سکتی۔ بڑی بی نے ذرا تفصیل سے کام لیا۔ ''اماں مجھے بھی اپنا بیٹا سمجھئے۔ جب تک آپ کے پیر میں تکلیف ہے میں سودا سلف دے جایا کرونگا۔ شمو نے آگے کی راہ کھولی۔

''میرے چاند خدا تمھیں سلامت رکھے کسی نیک والدین کی اولاد ہو''۔ بڑی بی کے کہنے پر شمو کو ایک بار پھر اماں یاد آگئیں۔ شمی خاموش کھڑی ستم کی بجلیاں گراتی رہیں۔ شمو خوشی سے بے حال واپس ہوئے۔ گھر میں داخل ہوئے وہی تذکرہ تھا اماں آنے والیوں کو کوسنے سے نواز رہی تھیں۔ اکرم صاحب سمجھا رہے تھے ''اللہ کی بندی ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں یہ دلھن سے پہلے جو ''چاندسی'' کا دم چھلا لگائے ہوا سے بھول جاؤ کوئی شریف لڑکی دیکھ کر بیٹے کا گھر بسا دو میں کہتا ہوں زینت میں کیا برائی ہے''۔

اے اس کالی موٹی بھینس کو تو سات جنموں نہ کروں نہ آنکھ ٹھیک نہ ناک۔ ''اپنے صاحبزادے کے بارے میں کیا خیال ہے''۔ اکرم صاحب نے چڑ کر کہا۔ خیال کیا ہوتا اللہ کا بنایا

ہوا ہے''۔ نفیسہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ ''اور زینب کو کسی انسانی ہاتھ نے بنایا ہے''۔ کہتے ہوئے اکرم صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ شمو ماں باپ کی بحث سن کر دل ہی دل میں مسکرا رہے تھے ''انہیں کیا پتہ میرا نصیب مجھے کہاں لے گیا تھا۔

دن گزرتے گئے بڑی بی کا پیر اب ٹھیک تھا۔ لیکن شمس صاحب کی عنایتوں نے انہیں مکمل خانہ نشین کر دیا تھا۔ تمام ذمہ داریاں اوڑھ لی تھیں۔ سنہرے خوابوں نے ہر طرف سے چھاپ لیا تھا۔ نہ گھر میں نکلتے تھے نہ اسٹور پر۔ نفیسہ بیگم تو تھیں ہی عقل سے پیدل انہیں کہاں اندازہ ہوتا کہ بیٹا کن ہواؤں میں اڑ رہا ہے لیکن اکرم صاحب کی جہاندیدہ نظروں نے تاڑ لیا۔ ''اب کہیں لڑکی دیکھ کر شمو کی شادی کر دو''۔ انہوں نے بیوی کو توجہ دلائی۔ ''اے لو اور سنو سارے شہر کی تو خاک چھان رہی ہوں''۔ ''یہ تم خوبصورتی کے چکر میں نہ پڑو ورنہ پچھتاؤ گی شمو کے قدم غلط پڑ رہے ہیں''۔ انہوں نے آگاہ کرنا ضروری خیال کیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ آج شمو بھی اماں کو سب بتا دینا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ رشتہ پکا کرلیں بیٹے سے تمام دوداد سن کر نفیسہ بیگم کی خوشی کی انتہا نہیں رہی وہ شہر بھر کی خاک چھاننے کے باوجود چاندی لڑکی حاصل نہیں کر سکیں اور بیٹے نے ایک ہی جست میں چاند فتح کر لیا۔ ''پھر کب جاؤں''۔ خوشی سے بے حال ہو کر دریافت کیا۔ ''بس دو ایک روز میں میں آپ کو لیکر چلونگا۔'' شمو نے مسکراتے ہوئے کہا دوسرے روز دل میں ہزاروں ارماں اور ہاتھوں میں سودے سلف کی کئی پوٹلیاں لیکر شمو حاضر تھے۔ بڑی بی آج زیادہ ہی خوش تھیں۔ شمی کے حوالے سامان کر کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

''بیٹے تم نے جو ہمارے لیے کیا ہے وہ شاید میرا سگا بیٹا بھی نہیں کرتا خدا تمھارے ماں باپ کا کلیجہ ٹھنڈا رکھے بس ایک آخری فرض اور رہ گیا ہے''۔ انہوں نے پیار سے شمو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''وہ کیا اماں''؟ ''بہن کو رخصت کرنے کا''! ''کیا؟'' شمو نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا تمھیں بتانا شاید مجھے یاد نہیں رہا بات یہ ہے شمی کا رشتہ تین سال سے میری بہن کے بیٹے سے پکا ہو گیا تھا۔ اس کی نوکری لگنے کا انتظار تھا۔ آج خط آیا ہے خیر سے اس کی نوکری لگ گئی۔ اگلے ہفتہ وہ لوگ نکاح اور رخصتی کے لیے آ رہے ہیں۔ بڑا خوبصورت نوجوان ہے تم دیکھو گے تو خوش ہو جاؤ گے'' بڑی بی جانے اور کیا کیا کہتی رہیں پر وہ سن ہی کہاں رہے تھے انہیں لگا سورج اپنے محور

سے ہٹ گیا ہے چاند کو ہمیشہ کے لیے مکمل گرہن لگ گیا ہے۔ شکستہ وجود کے ساتھ وہ گھر کی طرف
روانہ ہو گئے کاش اماں نے چاندی دلہن کی للک نہ اگائی ہوتی۔

اترن

وہ اسکول سے آکر بیٹھی ہی تھی کہ دستک کی آواز سے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا۔ شمسہ دروازہ کھولنے جا چکی تھی آنے والی اس کی ماں تھی جس کے کندھے پر بیگ اور ہاتھ میں تھیلی تھی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے لاکھ منع کرنے پر بھی ماں آج پھر سیٹھ عظمت کے یہاں گئی تھیں وہ کافی تھکی ہوئی لگ رہی تھیں۔ وہ جلدی سے اٹھی اور ماں کے لیے پانی کا گلاس بھر لائی۔ پانی پی کر جمیلہ کے اوسان درست ہوئے۔ شمسہ اس عرصہ میں بیگ کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھی..... ''امّی میں نے آپ سے منع کیا تھا آپ پھر سب بھر لائیں اور سیٹھ جی کی بیوی کو پانچ دس روپیہ نصیب نہیں تھے جو آپکو رکشے کے لیے دے دیں''۔ اس نے تلخ لہجہ میں کہا۔

''وہ بیچاری تو کہہ رہی تھی.... ''صرف کہہ رہی تھیں۔ دس بیس روپیہ سے خزانے میں کمی آجاتی''۔ اس نے ماں کی بات کاٹ کر کہا۔

''آپا ادھر دیکھو یہ سوٹ کتنا قیمتی ہے''۔ شمسہ نے اسے بیگ میں جھلملاتے کپڑوں کی طرف متوجہ کیا۔

''تمھیں دیکھو اور تمھیں پہنو''۔ اس نے اپنے معمولی سے سوتی لباس پر نظر ڈالتے ہوئے کہا جو اس نے دو سوٹوں کی کڑھائی کی اجرت سے خریدا تھا۔

''امّی کھانا لاؤں''...نہیں اب کیا کھاؤنگی ٹائم بہت ہو گیا ہے ایک کپ چائے بنا دے''۔

ماں کو چائے دے کر وہ دوبارہ تخت پر لیٹ گئی آنکھوں پر بازو رکھ کر بہت کچھ سوچنے لگی۔ وہ تین بہن بھائی تھے سلمٰی، شمسہ، اور سب سے چھوٹا سعد۔ زندگی میں سہولتیں اور آسائشیں تو کبھی نہیں تھیں لیکن بہر حال گزر رہی تھی باپ کسی فیکٹری میں ملازم تھے گھر اپنا تھا روکھی سوکھی کھا کر خوش تھے کہ ایک ایکسیڈینٹ نے ماں کو بیوہ اور انہیں یتیم بنا دیا۔ قریبی عزیزوں نے اس لیے آنکھیں پھیر لیں کہ اس بار گراں میں انکی ساجھے داری نہ ہو جائے زندگی بھی عجیب چیز ہے۔ روتی بلکتی

سکتی، گرتی پڑتی وقت مقررہ تک رواں رہتی ہے۔ وہ دس سال کی شمسہ پانچ سال اور سعد صرف ایک سال کا تھا۔ وہ ذہین اور حساس تھی گورنمنٹ اسکول میں درجہ سات کی طالبہ۔ جمیلہ نے سلائی مشین پکڑی اور شوہر کی زندگی میں گھر سے قدم نہ نکالنے والی سلائی کے کپڑوں کے لیے گھر گھر جانے لگی۔ سیٹھ عظمت کے گھر سے بڑی تعداد میں سلائی کے لیے کپڑے ملنے لگے۔ سیٹھ جی کی ایک ہی بیٹی تھی راحلہ بے انداز دولت نے ماں بیٹی کو نئے نئے ملبوسات کے ہوکے میں مبتلا کر دیا تھا۔ ہر ماہ دسیوں سوٹ بنتے اور چار جگہ پہن کر جانے کے بعد کینسل ہو جاتے یا پھر آوٹ آف فیشن۔ الماریوں میں نئے لباسوں کے لیے جگہ بنانے پر سیٹھ جی کی بیوی دریا دلی کا ثبوت دیتے ہوئے پرانے جمیلہ کو دے دیتیں۔ یہی حال اونی سوئٹروں اور جرسیوں کا تھا۔ اس کے دو بڑے فائدے تھے جمیلہ کی گردن احسان کے مارے جھک جاتی اور وہ سلائی کی اجرت میں اچھی خاصی کمی کر دیتی سلمیٰ کو ماں کا اس طرح کپڑے لانا شروع سے برا لگتا۔ وہ خودار لڑکی تھی۔ قدرت نے اس کو حسن اور ذہانت دونوں ہی نعمتوں سے نوازا تھا۔ اس کے برعکس سیٹھ جی کی بیٹی ایک کم رو خود پرست لڑکی تھی۔ لیکن جہاں بے حساب دولت ہو وہاں یہ چیزیں ثانوی ہو جاتی ہیں لاکھوں کا جہیز گاڑی اور سب سے بڑھ کر سیٹھ جی کی دولت کی تنہا وارث رشتوں کی کیا کمی ہو سکتی تھی نوید کا گھرانہ انکی ٹکر کا نہ سہی۔ لیکن اس کی تعلیم اور وجاہت کی وجہ سے رشتہ منظور کر لیا گیا۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق گھر میں گہما گہمی ہوگئی کارڈ تقسیم ہو گئے۔ جمیلہ غریب کو ایک ہفتہ بیشتر ہی سیٹھ جی کی بیگم نے بلا بھیجا۔ ''گھر کو بچیاں دیکھ لینگی تم ادھر آ جاؤ''۔ یہ اعزازی بلاوا نہ تھا خدمت لینے کی ایک ادا تھی۔ سلمیٰ کے لاکھ منع کرنے پر بھی جمیلہ بیگم صاحب کے کہنے پر خدمت کے لیے جا حاضر ہوئی۔ شمسہ البتہ نہ صرف ماں کے ساتھ گئی بلکہ ہفتوں شادی کی رونق کا آنکھوں دیکھا حال نشر کرتی رہی۔

سلمیٰ نے ہائی اسکول امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا آگے پڑھنے کے حالات نہیں تھے۔ لہٰذا قریب کے ایک اسکول میں سلائی کڑائی سیکھنے لگی۔ کہ ماں کا ہاتھ بٹا سکے۔ جمیلہ کو اب رات دن فکر رہتی تھی کہ کس طرح سلمیٰ کے ہاتھ پیلے کر دے لیکن کیسے؟ تبھی گھور اندھیرے میں امید کی کرن جاگی اس کی رشتہ کی بہن عرصہ بعد آئیں اور سلمیٰ کو دیکھتے ہی اپنے بیٹے نعیم کے لیے پسند کر لیا۔ نعیم نیک شریف دیندار نوجوان تھا پاور ہاؤس میں معمولی ملازم تھا۔ جمیلہ نے شمسہ کی

معرفت بنی کا عندیہ لینا ضروری خیال کیا۔ سلمیٰ حقیقت پسند لڑکی تھی نہ اس نے کوئی آئیڈیل گڑھا تھا نہ کسی کو دیکھ کر دل میں ہلچل ہوئی تھی۔ ''جیسی امّی کی مرضی''۔ کہہ کر نعیم کے رشتے پر مُہر لگا دی۔

ادھر بیگم صاحبہ نے جمیلہ کو بلا بھیجا۔ ''جمیلہ تمھارے لیے بہت کام ہے''۔ بڑی خوش دل سے کہا گیا۔ کیا؟ ''اللہ رکھے راحلہ امید سے ہے ساری تیاری سمجھو تمھیں کرنا ہے''۔

غریب جمیلہ ایک بار پھر پابندی سے مشین کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے دن رات ایک کر دیا۔ سلمیٰ بھی خالی وقت میں ماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔ سامان تیار ہو گیا لیکن دن رات کی محنت نے جمیلہ کو بیمار ڈال دیا۔ ادھر سیٹھ صاحب کی بیگم کا تقاضہ تھا کہ ڈیلوری کا ٹائم قریب ہے ایسے میں اس نے سلمیٰ سے کہا ''بیٹی رکشا میں سامان رکھوا کر دے آؤ میری طبیعت کا بھی بتا دینا''۔ سلمیٰ جانا تو نہیں چاہتی تھی لیکن ماں کے لجاحت بھرے لہجہ کو نظر انداز نہ کر سکی۔

''کپڑے بدل لو''۔ ''نہیں امّی ایسے ہی ٹھیک ہوں''۔ کہہ کر اس نے اپنے سستے سے سوتی پنک سوٹ پر نظر ڈالی بالوں کو ہاتھ سے برابر کیا۔ اس کے سلکی بال بے تحاشا لمبے تھے۔ وہ پہلی بار مجبوراً سیٹھ جی کے یہاں گئی تھی۔ دروازہ ملازم نے کھولا۔ اس نے سامان ملازم کے حوالے کیا اور اندر کی طرف قدم بڑھائے سامنے صوفے پر ایک وجیہ نوجوان بیٹھا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھا۔

''آیئے کہاں سے تشریف لائی ہیں''؟۔ ''جی مجھے بیگم صاحب سے ملنا ہے''۔

''بیٹھیے تو سہی''۔ ''نوجوان کی آنکھوں میں بے پناہ ستائش تھی۔ ''میں بیٹھنے نہیں آئی''۔

''کون ہے نوید''؟ اندر سے راحلہ کی آواز آئی۔ سیٹھ جی کی بیگم بھی کسی کمرے سے برآمد ہوئیں۔ غالباً ملازم نے اس کی آمد کا بتا دیا تھا۔ ''بیٹھو بیٹی تم جمیلہ کی بڑی والی بیٹی ہو نا''۔ ''جی امّی کی طبیعت خراب ہے اس لیے مجھے آنا پڑا آپ سامان چیک کر لیجیے۔ راحلہ بھی آ کر بیٹھ چکی تھی۔ ''کون ہے یہ''۔ نوید نے دریافت کیا۔ وہ ہمارے یہاں کے کپڑوں کی سلائی کرنے والی کی بیٹی ہے''۔ راحلہ نے حقارت سے کہا۔ سلمیٰ کھول اٹھی ''کیا دنیا میں دولت ہی سب کچھ ہے۔ انسان کی شخصیت اس کی خوبیاں سب بے حیثیت ہیں''۔ وہ خود پسند ہرگز نہیں تھی لیکن اتنا تو اندازہ بہر حال تھا کہ وہ راحلہ کے مقابلے میں کیا تھی۔

ابھی مشکل سے ایک ہفتہ گزرا تھا کہ معلوم ہوا راحلہ نے دو جڑواں بچوں کو جنم دیا ہے لیکن اس کی حالت تشویش ناک ہے۔ سیٹھ جی نے روپیہ پانی کی طرح بہادیا۔ لیکن بے اندازہ دولت راحلہ کو زندگی نہ دے سکی۔ بچے بمشکل ایک ہفتہ کے ہو نگے کہ وہ زندگی ہار گئی۔ اولاد کا غم دنیا کا غالباً سب سے بڑا غم ہے اور وہ تو تھی اکلوتی جس قدر بھی غم مناتے کم تھا۔ دونوں بچے ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے تھے۔ بچوں کی وجہ سے انہیں زندگی کی طرف لوٹنا تھا۔ لیکن کیسے بیٹی کی موت نے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ بچوں کی پرورش کا دم خم باقی نہ تھا۔ رہے ملازم بچے کہیں ملازموں کے سہارے بھی پلتے ہیں۔ پھر کیا ہو سکتا ہے اور راحلہ کا شوہر کم عمر نوجوان ہے آج نہیں تو کل دوسری شادی ضرور کرے گا۔ دوسری بیوی بچوں کی سوتیلی ماں، سوچتے سوچتے ایک خیال برق کی سی تیز رفتاری سے ان کے دماغ میں آیا۔

ٹھیک ہے یہ بہترین آئڈیا ہے۔ خدا کرے نوید راضی ہو جائے۔

شام میں نوید کے آنے پر ادھر اُدھر کی رسمی بات چیت کے بعد بیگم عظمت نے اپنے خیال کو الفاظ دیتے ہوئے اس کی منشا معلوم کی۔

''تم نے تو شاید اس کو دیکھا بھی ہے ایک بار کپڑے لے کر آئی تھی''۔ نوید کی نظروں میں گلابی ملبوس میں اس کا سراپا لہرایا بیٹے آج کل کی لڑکیوں کو تو تم جانتے ہو۔ بچوں کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گی۔ وہ غریب کی بچی ہے۔ تم سے شادی اس کے واسطے کسی اعزاز سے کم نہیں ہوگا۔ حکم کی غلام ہوگی''۔ انہوں نے مزید کہا۔ نوید نے جب سے سلمیٰ کو دیکھا تھا سیکڑوں بار اس کا حسین سراپا ذہن کے پردوں پر لہرایا تھا۔ وہ سیٹھ جی کی دولت سے خریدا ہوا ان کی نک چڑھی بیٹی کا شوہر ضرور تھا لیکن جذبوں پر بھی کہیں بندھ بندھے ہیں۔

''میں والدین سے محروم ہوں آپ میرے لیے والدین کا درجہ رکھتے ہیں آپ جیسا مناسب سمجھیں''۔ نوید نے دلی جذبوں کو دبا کر عام سے لہجہ میں کہا۔

''شمسہ امّی کہاں ہیں''؟ سلائی اسکول سے واپس آ کر سلمیٰ نے شمسہ سے دریافت کیا''امّی کو بڑی دیر ہوئی سیٹھ جی کے یہاں گئی ہوئی ہیں''۔ ''کیا کپڑے دینے تھے''؟

''نہیں امّی کو آنے دو''۔ کہہ کر سلمیٰ لیٹ کر ایک رسالہ دیکھنے لگی۔

جمیلہ کافی دیر سے لوٹی۔ عجیب گم صم سوچ کی واضح پرچھائیاں چہرے پر رقم تھیں۔

''کیا ہوا اماں خیر تو ہے''۔ سلمٰی نے ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔'' کچھ نہیں بس طبیعت یوں ہی سی ہے'' وہ رات جمیلہ نے سوچ سوچ کر گزاردی ''یہ سیٹھ جی کی بیوی کی محبت ہے جو میری بچی کا رشتہ اپنے داماد سے جوڑ رہی ہیں'' کاش نیک دل عورت انکے اندر چھپی خودغرضی کو پرکھ سکتی۔

اسے سلمٰی کی طرف سے اندیشہ تھا وہ شاید نہ مانے۔ نعیم کے مقابلے میں نوید وجاہت تعلیم رکھ رکھاؤ۔ ہر بات میں بڑھ چڑھ کر تھا۔ اسے سلمٰی سے بات کرنا ہی ہوگی اور پھر وہ ماں ہے اپنی اولاد کی زندگی کا فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔ اسے بہرحال بیگم کو جواب بھی دینا تھا۔

سلمٰی تو سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئی۔ نہیں امی ہرگز نہیں کیا اترنیں دے کر ان کا دل نہیں بھرا جو بیٹی کی اترن یعنی داماد کو بھی پیش کر رہی ہیں۔ جمیلہ نے ہر ہر پہلو سے سلمٰی کو سمجھایا۔ لیکن اس کی نہ ہاں میں نہیں بدلی سیٹھ جی کی بیوی نے سنا اور خود آکر سلمٰی کو تو سمجھایا ہی ساتھ میں جمیلہ سے بھی کہا۔''تم کیسی ماں ہو ارے وہ بچی ہے۔ جب عیش کر یگی تب سوچے گی کہ ماں نے اس کے لیے کتنا اچھا سوچا۔ تم اس کی پرواہ مت کرو۔ تاریخ مقرر کردو''۔ سلمٰی نے سب کچھ سنا۔ وہ بالکل خاموش ہو کر رہ گئی۔ کبھی کبھی جمیلہ کو اس کی خاموشی سے خوف آتا۔ سلمٰی دیر تک نہیں جاگی تو جمیلہ کو فکر ہوئی۔

''شمسہ بہن کو دیکھ کتنا دن چڑھ آیا ابھی اٹھی نہیں کہیں بخار وخار تو نہیں آ گیا''۔ جمیلہ نے فکرمندی سے کہا'' امی آپا تو اٹھ ہی نہیں رہیں تکیہ کے پاس یہ پرچہ رکھا ہے۔ کیسا پرچہ کیا لکھا ہے۔

''امی آپ جانتی ہو مجھے بچپن سے اترن سے نفرت رہی ہے۔ آپ نے میرے لیے زندگی بھر کی اترن تجویز کردی میں جا رہی ہوں شمسہ راحلہ کی اترن شوق سے پہنتی تھی۔ یہ آخری اترن بھی اس کو دیدینا۔ سلمٰی''۔

صحن میں جنازہ رکھا تھا۔ جمیلہ سینہ کوبی کر رہی تھی۔ اپنی ذہین، حسین اور خوددار بیٹی کی موت کا ذمہ دار اپنے کو سمجھ رہی تھی۔ سیٹھ جی کی بیوی بھی موجود تھیں۔ دم بخود لب بستہ۔ تو کیا وہ بھی سلمٰی کی موت کی ذمہ دار ہیں۔ آج انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ دولت سے مادی اشیاء خریدی جاسکتی ہیں کسی کا دل نہیں اس کے جذبے بے مول ہوتے ہیں۔ سلمٰی کی موت نے کتنے ہی دل و دماغ کے بند دریچوں کو کھول دیا تھا۔

خراجِ بے گھری

کہتے ہیں انسان کی بنیادی ضرورت روٹی، کپڑا اور مکان ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان تین چیزوں میں سب سے اہم کیا ہے۔ آپ کہیں گی روٹی ساتھ یہ جواز بھی پیش کرینگے کہ دو آخراند کے بغیر تو انسان زندہ رہ سکتا ہے روٹی کے بغیر نہیں۔ لیکن میری سوچ ہے کہ سب سے ضروری چیز مکان ہے۔ سر چھپانے کی جگہ انسان کی پہلی ضرورت ہے۔ روٹی کپڑا بعد میں دیکھا جائے گا۔ شاید نہیں یقیناً آپ میرے نظریہ سے متفق نہیں ہونگے تو آہستہ سے سنیے بلکہ کان قریب لایئے میں بے گھر ہوں۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جس کے پاس جو نہیں ہوتا وہی اس کے لیے سب سے اہم ہوتا ہے۔ خیر اب سکون سے میری بے گھری کی کہانی سنئے۔

بارہ سال سے یعنی جب سے میری شادی ہوئی کرائے کے مکان میں رہتی آ رہی ہوں۔ کرائے کے مکانوں کے تلخ تجربات میں میری ساس بھی برابر کی شریک ہیں کیونکہ میرے آنجہانی خسر صاحب بھی ذاتی گھر سے محروم تھے لیکن وہ زمانہ اور تھا۔ محبت، مروت وخلوص باقی تھا میری ساس صاحبہ کے بقول وہ ہمیشہ سے ایک نیم حکیم صاحب کے مکان میں کرائے پر رہتی تھیں۔ میرے شوہر کی پیدائش بچپن اور لڑکپن وہیں گزرا۔ پہلے زمین زیادہ تھی اور اس پر بسنے والے کم۔ لہٰذا مکانوں کے صحن بڑے ہوتے تھے حکیم صاحب کے مکان کے صحن میں امرود، انار اور چکوترے کے کئی پیڑ تھے۔ لیکن مروت اور خلوص کے باوجود حکیم صاحب کا فرمانا تھا کہ بھئی کرائے پر صرف گھر دیا ہے پیڑ نہیں۔ پھلوں کی حفاظت میں ہماری ساس ہلکان ہو جاتیں پکنے پر حکیم صاحب تشریف لاتے پھلوں سے تھیلے بھرتے بمشکل ایک دو امرود اور انار یہ کہہ کر دے جاتے بھابی یہ میری طرف سے انور کو دیدینا۔ صحن کے ایک کونے میں پختہ کنواں تھا۔ غنیمت تھا کہ اس کے پانی پر پابندی نہیں تھی ورنہ پیڑوں کی طرح کنویں کے بارے میں بھی حکیم صاحب حکم جاری کر سکتے تھے کہ بھائی کرایہ پر گھر دیا ہے کنواں نہیں۔ خیر یہ تو تھے میری ساس کے فرمودات۔ میری کہانی کچھ یوں ہے کہ میں چار بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ اکلِ حلال پر گزارا کرنے والے والدین کے

سر پر چار پہاڑ رکھے تھے ایسے میں جب انور کا رشتہ گیا تو ان کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اچھی شکل و صورت کے ساتھ بی۔اے پاس (یہ اور بات کہ ڈویزن تھرڈ تھی) گورنمنٹ کے ملازم بھی تھے (کلاس فور کے سہی) جس لڑکے میں اتنی خوبیاں ہوں تو اس جھمیلے میں کیوں پڑا جائے کہ ذاتی گھر ہے یا نہیں۔ قصہ مختصر میں بیاہ کر ایسے گھر میں آ گئی جس کا کمرہ تو کشادہ تھا لیکن چھت زمانے کے سرد گرم دیکھ کر انتہائی بوسیدہ ہو چکی تھی۔ صحن کے ایک کونے میں چھوٹی مشین کا ایک ہینڈ پمپ بھی تھا جس کو جلدی ہی میرے سیدھے بازو سے دشمنی پیدا ہو گئی۔ کرایہ انتہائی کم صرف 300 روپیہ ماہوار سب کچھ غنیمت ہی ہوتا اگر ہندوستان میں چار مہینہ برسات کا موسم نہ ہوتا۔ ادھر آسمان سے بوند ٹپکی اُدھر چھت نے کہا ٹھہرو ساتھ ساتھ برسینگے۔ ساس جلدی سے حرکت میں آتیں تسلے، بالٹی سے لے کر پلیٹیں کٹورا گلاس تلک میرے جہیز کے بیڈ پر اپنی بہار دکھانے لگتے۔ والدین الگ مطمئن کے بیٹی کھلے آسمان کے نیچے نہیں ایک چھت کے سائے میں ہے۔

جب سے میں دو جڑواں بچوں کی ماں بنی میری ساس کو وہ گھر اچھا لگنے لگا بار بار کہتیں بڑا مبارک گھر ہے اللہ نے دو لال ایک ساتھ دیے۔ حالانکہ میں کہیں بھی ہوتی اوپر والے کے حکم سے بچوں کو دنیا میں آنا تھا گھر کی برکت کہاں سے درمیان میں آ گئی میں خوف زدہ ہو گئی کہ اگر آئندہ بھی ایسی ہی برکت قائم رہی تو میرا کباڑہ ہو جائے گا۔ خیر سچائی یہ ہے کہ مجھے بوسیدہ گھر کے علاوہ کوئی تکلیف نہیں تھی مشفق ساس پُر محبت شوہر۔ بچے بڑے ہونے لگ اور مکان کی چھت خستہ سے خستہ تر خوف تھا کہ کسی روز ہم اس میں زندہ دفن نہ ہو جائیں میرے شوہر نے سرگرمی سے مکان کی تلاش شروی کر دی۔ کتنے ہی مکان دیکھ ڈالے آخر ایک دوست کی مدد سے ایک ایسی بلڈنگ کا پتہ چل ہی گیا جس میں دو دو کمروں والے تقریباً بارہ فلیٹ تھے۔ انہوں نے جلدی سے یہ خوش خبری سنائی میں یہاں رہ کر اس قدر اُب چکی تھی کہ لگا وہائٹ ہاؤس پر قبضہ ہونے جا رہا ہے کہاں؟ کدھر؟ میری ساس بھی جلدی سے قریب آ گئیں۔ ''حامد منزل''۔ ہائیں میں گھبرا کر انہیں اس طرح دیکھنے لگی مانو ان کے سر پر نکیلے سینگ اُگ آئے ہوں۔

''کیا؟ حامد منزل آپکی طبیعت تو ٹھیک ہے اسمیں تو ایشاء کی عظیم رضا لائبریری ہے کیا وہ کہیں اور منتقل ہو گئی''۔ وہ میری نادانی پر مسکرائے بھئی وہ والی حامد منزل نہیں محلہ قصاباں میں حامد

صاحب کی بنوائی ہوئی بلڈنگ ہے جس پر نام کی مناسبت سے حامد منزل لکھا ہوا ہے۔

''اچھا اچھا میری خوشی دیدنی تھی۔قصہ مختصر ہم حامد منزل کے مکیس ہونے کو چل دیے دوسری منزل ہی ہمارے ارمانوں کی منزل تھی جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے فلیٹوں کے دروازے وا ہوئے وہاں کے باسی جن میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی گھیرا باندھ کر ہمیں اس طرح دیکھنے لگے جیسے سڑک پر بندر کا تماشہ دیکھتے ہیں۔کسی طرح لدے پھندے اوپر کی منزل پر پہنچے۔ جسے ہی دروازہ کھولا اندر گہری تاریکی استقبال کو ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔

میں نے پرس سے موم بتی نکالی۔انور بھاری بھرکم سامان اندر لاتے ہوئے بے دم سے کمرے میں داخل ہوئے۔ ماچس اُن سے لیکر موم بتی روشن کی اور اس کی ناکافی روشنی میں سامان ادھر کیا۔غور سے دیکھنے پر لائٹ کی فٹنگ موجود تھی خیر سے دو بلب بھی تھے لیکن اندھیرا ہمارا مقدر تھا۔سامان کی اٹھا پٹخ میں کافی رات بیت گئی۔اچانک دھڑا دھڑ دروازہ بجایا جانے لگا۔

''اس وقت کون آ گیا''؟

میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور بیہوش ہوتے ہوتے بچی میرے سامنے فلم اسٹارٹن ٹن کا دوسرا روپ تھا ویسے ہی لمبے لمبے بندے پہنے۔''آپ کون ہیں''۔خوف زدہ لہجے میں سوال کیا۔ساس بھی جلدی سے قریب آ گئیں۔''کون ہو اس وقت کیا کام ہے''انہوں نے کہا۔

''آپ کو نہیں معلوم ہم مالک مکان ہیں''۔''اچھا اچھا اندر آئیے'' ساس محترمہ نے آداب میزبانی نبھایا وہ اندر آ کر بیڈ پر اس طرح بیٹھیں کہ معمولی لکڑی سے بنے بیڈ نے چرسے ایک مظلوم آواز نکالی۔میرے شوہر جلدی سے کھڑے ہو گئے۔''فرمایئے کیسے تکلیف کی''۔

''بھئی فرمانا یہ ہے کہ جب سے آپ لوگ آئے ہو برابر دھڑ پڑ کی آوازیں آ رہی ہیں''۔''محترمہ ہم سامان سیٹ کر رہے ہیں''۔

خیر میں تو اوپر رہتی ہوں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن آپ کو بتا دوں اس کمرے کے ٹھیک نیچے افروزہ خالہ رہتی ہیں بہت کمزور شوگر اور بلڈ پریشر کی مریض اگر آپ کے شور پکار دھما دھم سے انہیں کچھ ہو گیا تو اس کی ذمہ داری آپ پر ہو گی۔ان کے فرمودات پر ہم تینوں ہونق ہو کر ایک دوسرے کو تکنے لگے۔بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی''اندھیر نگری چوپٹ راج''جس کی مملکت میں

ایک چور نے کسی کی دیوار پھاندی دیوار کمزور تھی چور اس کے نیچے دب کر مر گیا راجہ نے مالک مکان کو سولی پر چڑھا دیا۔

''بھئی کیا سوچ رہی ہو چائے بناؤ''۔شوہر کی آواز سے میں چونکی۔

''نہیں آج تو رہنے دو ویسے روز ہی پیتی رہونگی۔ دن میں خدا جھوٹ نہ بلوائے دس بارہ کپ ہو جاتے ہیں تم جانو روز ہی کرایہ داروں کی خیریت معلوم کرنے جاتی ہوں اب بھلا بغیر چائے کے کون آنے دیتا ہے'' وہ اٹھ کھڑی ہوئیں ''اور سنو صبح چار بجے سے پانچ تک پانی کی موٹر چلتی ہے آپ لوگ جلدی اٹھ کر اسٹاک کر لیں''۔ ''اتنی صبح'' ہاں بھائی اس بلڈنگ کا یہی رول ہے۔ ''بجلی تو ہے نا'' میری ساس نے کہا۔''ہاں ہے تو ہم نے کرایہ داروں کو تھانے والی لائن دے رکھی ہے یہ لائن آنکھ مچولی کرتی ہے''۔ ''آپ کے یہاں تو کافی تیز لائٹ ہے''۔انور نے کہا۔

''ہاں بھائی ہمارے یہاں دوسری لائن ہے وہ دراصل مالک مکان اور کرایہ داروں میں فرق تو ہوگا ہی''انہوں نے فخریہ راجہ بھوج اور گنگو تیلی کا فرق سمجھایا۔

''الٰہی خیر یہاں کیسے گزارہ ہوگا''۔میری ساس نے آہ سرد کے ساتھ کہا۔

صبح ہڑ بڑا کر اٹھی پانچ بج کر کچھ منٹ اوپر ہوئے تھے جلدی سے نل کھولا پانی ندارد جیسے تیسے میاں سڑک کے نل سے چند بالٹیاں لائے ناشتہ بنایا۔مالک مکان خیریت کے لیے حاضر تھیں۔ ''بھئی اچھی تو رہیں''۔ گویا انہیں خوف تھا کہ رات بھر میں ہم میں سے کوئی فوت نہ ہو گیا ہو۔ناشتہ میں برابر سے شریک رہیں انور کی فرمائش پر آج کوفتے اور بریانی بنائی۔ بریانی کو دم پر لگا کر ابھی میں کوفتے بھون ہی رہی تھی کہ بی بی ٹن ٹن نے دروازہ وا کر کے اندر جھانکا۔''بڑی عمدہ خوشبو ہے کیا پک رہا ہے''۔

میں نے بتایا وہ دروازہ کھول کر اندر آ گئیں۔واہ واہ میرا تو عرصہ سے دل چاہ رہا ہے مگر آپ جانو اس ڈیل نے بیکار کر دیا محنت کا کام ہوتا نہیں۔''آپ آج ہمارے ساتھ کھالیں''۔میں نے دل میں چڑ کر بظاہر اخلاق نبھایا۔

''نہیں توبہ کرو میں کسی کے گھر کھانا نہیں کھاتی آپ دونوں چیزیں دے دیں''۔ میں نے مجبوراً دونوں چیزیں انکے حوالے کیں جاتے جاتے پلٹیں ''ایسا کرو ایک پلیٹ میں نیچے والی

افروزہ خالہ کے واسطے بھی نکال دو''۔ میں نے غور سے دیکھا۔ نگاہوں کا مطلب سمجھ کرانہوں نے وضاحت دی۔ مجھے ان سے سلائی کا کچھ کام کرانا ہے۔ پکانے میں لگ گئیں تو میرا حرج ہوگا۔ ان کی فرمائش پوری کرنے کے بعد کوفتے ندارد تھے۔

میری ساس کے ایک بھائی جنہیں سب چھوٹے بڑے بھین ماموں کہتے تھے۔ بڑے پرمحبت انسان تھے وہ اکثر آتے رہتے بیچارے ساٹھ کے لگ بھگ ہونگے۔ نظر کمزور اتفاق سے ایک ٹانگ بھی کریک لنگڑا کر چلتے تھے۔ ایک شام آئے اور دیر تک بیٹھے رہے۔ اندھیرا پھیلنے پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''ابھی رک جاؤ بھیا انور آتا ہوگا نیچے تک چھوڑ آئے گا''۔ میری ساس نے کہا۔

''ارے آپا کیا اندھا لنگڑا سمجھا ہوا ہے'' کہہ کر وہ مسکراتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ ابھی انہیں گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ باہر عجب سا شور ہوا ملی جلی مختلف آوازیں۔ ''ارے اماں دروازے میں ٹانگیں پڑی ہیں''۔

''ارے کیسی ٹانگیں''۔ لگتا ہے کسی نے سفلی کرا کے پھینک دی ہیں'' اے یہ نئے کرایہ داروں کا کارنامہ تو نہیں'' ہمارا دروازہ بج اٹھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے آواز دی کون؟۔ ''دروازہ کھولو''۔ میاں کی آواز سن کر جان میں جان آئی۔ دیکھا وہ ماموں کا بازو پکڑے کھڑے ہیں۔ اندر آ کرانہوں نے ماموں کو پلنگ پر بیٹھایا۔ ''یہ شور کیسا تھا''۔ میری ساس نے دریافت کیا۔

''انور تم ان مظلوموں کو کہاں لے آئے خدا ہی جانے یہاں کس ٹائپ کی مخلوق رہتی ہے''۔ ہوا کیا؟

ہونا کیا تھا میں زینے سے پھسل گیا ابھی اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک چیخ سنی۔ اماں دروازے پر ٹانگیں پڑی ہیں میری ٹانگیں چیخنے والی کے کمرے کے قریب تھی تعجب ہے اسے چھ فٹ کا انسان نہیں صرف ٹانگیں نظر آئیں لاحول ولاقوۃ۔ انور ہنس پڑے اور میں سوچنے لگی روؤں یا ہنسوں۔

اگلی صبح میاں دفتر روانہ ہوئے میں نے سوچا کپڑے سیٹ کرلوں میں ابھی اپنی قیمتی اکلوتی ساڑھی کو پیار سے ہینگر کر رہی تھی کہ بی ٹن ٹن پھر آ موجود ہوئیں۔ ''بھئی ساڑی بڑی خوبصورت ہے''۔ ''جی انور بمبئی سے لائے تھے''۔

''اللہ قسم جی خوش ہو گیا آج ذرا مجھے سالگرہ میں جانا ہے بس یہی پہن کر جاؤنگی''
انہوں نے میرے ہاتھ سے ہینگر لیتے ہوئے کہا۔ دروازے کی طرف قدم بڑھائے پھر کچھ سوچ کر پلٹیں اس کا میچنگ سیٹ تو ہو گا ہی'' ''جی نہیں'' وہ تو میں ہکلا کر رہ گئی۔

اے کھانہیں جاؤں گی بس صبح واپس کر دونگی۔ میں نے ساس کو لاچاری سے دیکھا لیکن وہاں بھی لاچاری ہی لاچاری تھی شام کو میں نے میاں صاحب کو بتایا کہنے لگے بھئی اتنی تنگ دل مت بنو وہ مالک مکان کے ساتھ پڑوسی بھی ہیں اور پڑوسی کے حقوق کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں۔

وہ پہلی صبح تھی جب بیگم حامد نے ہماری خیر و عافیت کرنا ضروری نہیں سمجھا دن بھر انتظار کے بعد شام اترنے لگی تب میں نے سوچا خود ہی جا کر ساڑی لے آؤں میں پہلی مرتبہ ان کے فلیٹ میں گئی۔ وہ اطمنان سے بیڈ پر دراز تھیں۔

''آؤ آؤ بیٹھو''۔ جی اس وقت بیٹھ نہیں سکتی بس وہ ساڑی اور سیٹ میں نے رکتے رکتے کہا گویا خیرات مانگ رہی ہوں۔ ''بڑی بے صبری ہو''۔ انہوں نے قدر افزائی فرماتے ہوئے لڑکی کو آواز دی۔

''سنو اوپر ساڑی سوکھ رہی ہے جا کر لے آ''۔ میں چونکی۔ سوکھ رہی ہے آپ نے اس کو دھونے کی تکلیف کیوں کی کیا بتاؤں بڑے لوگوں کا نام ہی نام ہے رتی بھر سلیقہ نہیں ایک بدتمیز نے سالن کا ڈونگا اس طرح دیا کہ آدھے سے زیادہ سالن ساڑی پر آ گرا۔ وہ تو شکر سالن زیادہ گرم نہیں تھا ورنہ جلنے میں کون سی کثر رہ جاتی۔ ہائے میری قیمتی ساڑی'' میں اندر سے لرز گئی۔

کچھ ہی دیر میں کام والی لڑکی ساڑی کو اس طرح گھسیٹتی ہوئی لائی کہ آدھی اس کے ہاتھوں میں آدھی زمین پر میں نے بے صبری سے کھول کر دیکھا پلو سے آدھے گز کے قریب پھٹ چکی تھی۔ ''یہ دیکھئے'' میں نے پلو ان کے سامنے کیا۔

''اوہ ان کے لان میں بڑے خوبصورت گلاب لگے تھے اب تم جانو گلاب میں کانٹے تو ہوتے ہی ہیں اس میں الجھ گئی۔ ویسے رفو ہو جائے گا''۔ بے نیازی سے جواب ملا۔

اب وہاں ایک منٹ ٹھہرنا بھی دشوار تھا اپنے کمرے میں آ کر میں نے ساڑی فرش پر

چھینکی اور ساس کے کندھے پر سر رکھ کر بے تحاشہ رو پڑی۔ واقعہ سن کر غصہ انہیں بھی بہت آیا پھر کچھ فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئیں۔ شام کو انور کے دفتر سے آنے کے بعد میری ساس نے پرانے مکان میں جانے کا فیصلہ سنا دیا وہ حیران تھے ان کے استفسار پر انہوں نے پوری روداد کہہ سنائی۔ ایک بار پھر ہم اسی بوسیدہ مکان میں جانے کو سامان پیک کر رہے تھے۔

میرے خدا اتنا تو معتبر کر دے
میں بے مکان ہوں صاحب گھر کر دے

خدائی فیصلہ

جس نے بھی اس خبر کو سنا حیران ہی تو رہ گیا۔ اخبار والے تو ایسی خبروں کی تلاش میں رہتے ہیں لہٰذا مختلف عنوانات ''قانون داں کے ہاتھوں قانون کا قتل''۔ ''بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا'' ''ملک میں اب بھکاری بھی محفوظ نہیں'' کی سرخیوں سے اس خبر کو خوب اچھالا۔ T.V چینلس بھی کہاں پیچھے رہنے والوں میں تھے۔ شہر کے معروف وکیل ایڈوکیٹ فراست فاروقی تو دنگ ہی رہ گئے۔ ایڈوکیٹ نعیم باسط، مشہور بزنس مین کا بیٹا نیک فطرت، خوش مزاج وجیہ نوجوان ''لا'' کا ڈگری ہولڈر جو مستقبل میں منصف کے عہدے پر فائز ہونے جارہا ہو اور ایک بوڑھی بھکارن کا قتل کوئی تال میل سر پیر سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

فراست فاروقی شہر کے وہ کامیاب ترین وکیل تھے کہ کسی بھی کیس کا ان تک آنا ہی کامیابی کی ضمانت تھی اپنے تیس پینتیس سالہ کیریر میں انہیں شاید ہی کبھی ہار کا منھ دیکھنا پڑا ہو۔ ندیم سے انہیں دلی لگاؤ تھا کورٹ میں تو وہ ملتے ہی تھے لیکن گھر پر بھی ندیم کا آنا معمول کی بات تھی ان کی بیوی نعیمہ بیگم بھی اسے ایک بیٹے کی طرح چاہتی تھیں آج اتوار کی وجہ سے وہ گھر ہی پر تھے سامنے میز پر صبح کا اخبار رکھا تھا۔ چائے رکھے رکھے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

''کیا سوچ رہے ہیں چائے برف ہوگئی'' انہیں گہری سوچ میں غرق دیکھ کر نعیمہ بیگم نے کہا۔ ''ندیم کل شام ایک اپاہج بھکارن کے قتل کے الزام میں گرفتار ہو گیا''۔ انہوں نے دھماکا کیا۔ کیا؟ نعیمہ بیگم حق دق رہ گئیں۔ ''دیکھو آج کا اخبار''

''وہ ایسا ہرگز نہیں ہے نہ ہی ایسا کر سکتا ہے میرا دل گواہی دیتا ہے وہ بہت نیک فطرت لڑکا ہے'' نعیمہ بیگم نے کہا۔

جب حقائق سامنے ہوں تو دل کی گواہی احمقانہ فعل بن کر رہ جاتی ہے یقین تو مجھے بھی نہیں ہے خیر میں باسط صاحب سے ملتا ہوں۔ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

باسط صاحب کے ڈرائنگ روم میں شہر کی سرکردہ ہستیوں کے ساتھ پولیس پارٹی بھی

موجود تھی۔ سوال و جواب کا سلسلہ جاری تھا۔ فراست صاحب کو دیکھ کر باسط صاحب کے چہرے پر ایک گونا سکون سا در آیا۔ پولیس معمول کی تفتیش کے بعد روانہ ہوئی باسط صاحب نے سکون کا سانس لیا اور فراست صاحب سے مخاطب ہوئے۔

وکیل صاحب میں بہت پریشان ہوں جو کچھ ہوا میں تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔

''بس کیا کہا جائے میں خودشاکی ہوں ایسا نوجوان جس کی نیکی شرافت اور خداترسی کی لوگ قسمیں کھاتے ہیں میں خود اس کی صفات کا گواہ ہوں اور ایسا قبیح فعل عقل حیران ہے''۔ فاروقی صاحب نے کہا۔

''میرا خیال ہے وہ کسی دشمن کی سازش کا شکار ہوا ہے''۔ باسط صاحب کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ ''قتل گلا گھونٹ کر کیا گیا ہے مرنے والی کی آنکھیں حلقوں سے باہر تھیں باسط صاحب نے تفصیل میں جاتے ہوئے کہا آگے کی تفصیلات وہی تھیں جو اخبارات میں درج تھیں کہ ایک ادھیڑ عمر کے اجنبی شخص نے اسکو پکڑ لیا اور شور مچا دیا قریب ہی ایک چائے خانہ تھا جلدی ہی لوگ اکٹھے ہو گئے اور پولیس کو اطلاع دی گئی۔

''اس شخص نے پولیس کو کیا بتایا''۔ فاروقی صاحب نے ایک کامیاب نکتہ کی طرف اشارہ کیا'' وہ ملا ہی کہاں بھیڑ اکھٹا ہوتے ہی کہیں کا کہیں نکل گیا''۔

''پہلی غلطی جو شخص چشم دید گواہ تھا جس کی چیخ پکار پر لوگ اکھٹے ہوئے پولیس نے اس کو آسانی سے فرار ہونے دیا یہ ہے اپنے ملک کی پولیس کی کارکردگی''۔ فاروقی صاحب نے کہا ''سوال یہ ہے کہ ندیم آخر وہاں کرنے کیا گیا تھا یا پھر سوچی سمجھی اسکیم کے تحت اسکو کال کر کے بلایا گیا تھا''۔ ''ہُنہ''! فاروقی صاحب کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔

''میں کئی روز سے اس کو الجھا ہوا دیکھ رہا تھا ماں کے استفسار پر اس نے صرف یہی کہا کہ کسی کیس کے سلسلہ میں الجھتی ہے آپ کے یہاں بھی تو پابندی سے جاتا تھا آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا''۔ ''میرے یہاں بھی کئی روز سے نہیں آیا''۔ فاروقی صاحب نے سوچ سے باہر آ کر کہا۔

بہرحال آپ ہی کچھ کیجئے میری پریشانی تو جہ ہے سو ہے لیکن اس کی ماں کا برا حال ہے ویسے ہی وہ بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں۔ باسط صاحب نے کہا۔

اللہ مالک ہے میں چلتا ہوں۔ فاروقی صاحب نے باسط صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا فاروقی صاحب اس کے روبرو تھے۔ ''انکل آپ اس کیس میں مت الجھئے میں نے سوچ لیا ہے میں اقبالِ جرم کرلونگا''۔ ''کیا بکتے ہو تم مجرم نہ ہو کر اقبال جرم کرلو گے''۔

''آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ مجرم نہیں ہوں''۔ ندیم نے کہا

میری عمر کا بیشتر حصہ مجرموں کے چہرے پڑھنے گزرا ہے۔ مجرم اور ملزم کا فرق تو جانتے ہی ہو مجھے کامل یقین ہے تمھارے باپ کے کسی کاروباری حریف نے تمھیں پھنسانے کی کوشش کی ہے واردات کر کے فوری نکل گیا ہو۔ میرا خیال ہے مجرم وہی ہے جس نے شور مچا کر لوگوں کو متوجہ کیا''۔ فاروقی صاحب کا تجربہ بول رہا تھا۔ ندیم نے کوئی جواب نہیں دیا وہ دور خلاؤں میں نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ ''انشاء اللہ جلد ہی اصل مجرم کو بے نقاب کر کے تمھیں باعزت بری کراؤنگا''۔ انھوں نے ندیم کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

ابتدائی سماعت شروع ہو چکی تھی۔ چائے خانے کا مالک اور چند لوگ گواہاں میں شامل ضرور تھے لیکن چشم دید گواہ ایک بھی نہیں تھا صرف ایک شخص کے شور مچانے پر لوگ تیزی سے آئے لیکن آخر وہ شخص کہاں گیا۔

سوچنے سے مسائل حل نہیں ہوتے عمل ضروری ہے۔ اور عملی قدم اٹھائے جا چکے تھے۔ ''دولت'' یہ چار حرفی لفظ دنیا کے بڑے سے بڑے مسئلے کا — ننانوے فیصدی حل ہے ایک کو تقدیر کے خانے میں رکھا جا سکتا ہے باسط صاحب اور فاروقی صاحب نے افسرانِ بالا کے ذریعے اس شخص کی تلاش شروع کرادی جو اس کیس کا عینی گواہ تھا۔ فہیم نامی وہ بندہ جلد ہی پولیس کی گرفت میں آگیا۔ ابتدائی تفتیش سے پتہ چلا کہ حال ہی میں وہ عمر قید پوری کر کے جیل سے چھوٹا ہے وہ بہت گھبرایا ہوا تھا لیکن جب اس سے کہا گیا کہ صرف گواہی دینا ہے تو وہ نارمل ہو گیا۔

ایڈوکیٹ فاروقی صاحب ایک بار پھر ندیم کے سامنے تھے لیکن وہ بالکل خاموش تھا کسی سوال کے جواب دینے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔ آخر کون سا راز ہیں جس نے ندیم کو خاموش کر دیا ہے؟

فاروقی صاحب نے طے کر لیا تھا کہ وہ یا تو ندیم کی زبان کھلوا کر رہینگے یا پھر اس کیس

سے ہاتھ اٹھا لینگے۔ ''ندیم مجھے افسوس ہے تمھیں مجھ پر بالکل بھروسہ نہیں''۔ ''سر ایسا نہیں ہے''

''اگر ایسا نہیں ہے تو بتاتے کیوں نہیں تم کو وہاں کس نے بلایا تھا وہاں کیا کرنے گئے تھے''۔ ندیم ایک بار پھر خاموشی اختیار کر چکا تھا۔ فاروقی صاحب نے سوچا ضرور تھا کہ وہ کیس سے ہاتھ اٹھا لینگے لیکن ممکن نہیں تھا۔ ندیم کا بے داغ کریکٹر اس کی شرافت، انسانیت، رحم دلی اور سب سے بڑھ کر باسط صاحب سے تعلقات ایک شریف نوجوان کا مستقبل یہ تمام وجوہات محو کرنے والے نہیں تھے۔

وہ اپنے آفس میں بیٹھے دیر سے اس گھتی کو سلجھانے میں سوچ بچار میں مشغول تھے کہ ایک نسوانی آواز ''سر میں اندر آسکتی ہوں'' پر چونک کر سیدھے ہو بیٹھے۔ ''یس کم ان'' وہ اندر داخل ہوگئی۔ ''تشریف رکھئے'' سامنے رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا۔

''سر مجھے فاروقی صاحب سے ملنا ہے''۔

''فرمایئے میں ہی ہوں''۔ کہہ کر انہوں نے لڑکی پر ایک جانچتی نظر ڈالی۔ انتہائی حسین اور ماڈون رچہرے پر الجھنوں کے واضح تاثرات کے ساتھ بے پناہ گھبراہٹ بھی تھی۔ فاروقی صاحب کے لیے یہ معمولی بات تھی اس قسم کی لڑکیوں کے اپنے ہی مسائل ہوتے ہیں۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے اس کے بولنے کا انتظار کرتے رہے لڑکی کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے وہ غالباً انکی مرعوب کن شخصیت کے سامنے ''کہوں یا نہ کہوں'' کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔

''فرمایئے میں آپکی کیا خدمت کر سکتا ہوں''۔ گونجدار بھاری آواز اس کے کانوں میں پڑی ''وہ بات یہ ہے کہ.......

بے فکر ہو کر اپنی پرابلم بتایئے۔ فاروقی صاحب نے آگے بولنے کی راہ ہموار کی ''سر میں ندیم کے سلسلہ میں یہاں آئی ہوں''

''کیا؟''۔ فاروقی صاحب نے ریوالونگ چیر گھما کر اندازِ نشت تبدیل کیا۔

''سر وہ بے قصور ہے اس نے کوئی خون نہیں کیا آپ ہی اسے بچا سکتے ہیں''۔ لڑکی کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا سر میں آپ کو دگنی فیس دینے کو تیار ہوں اس نے پرس سے بڑے نوٹوں کی گڈیاں نکالتے ہوئے مذید کہا۔

''انہیں رکھو اور اس کیس میں اپنی دلچسپی بتاؤ۔ ندیم کو کب سے جانتی ہو''۔ فاروقی صاحب نے جانچتی نظر اس کے چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''سر باسط انکل میرے پاپا کے گہرے دوستوں میں سے ہیں ہم شروع سے......... لڑکی کے چہرے پر فطری حیا کے سائے تھے۔

''ہُنہ'' فاروقی صاحب کا ''ہُنہ'' معنی خیز تھا۔ اتنا تو وہ سمجھ ہی گئے تھے کہ لڑکی کی بیقراری کس وجہ سے ہے اور یہ کہ وہ بہت کچھ جانتی ہے۔

''تم کس بنا پر اس کو بے قصور ثابت کرنا چاہتی ہو''؟ ''سر میرا دل گواہی دیتا ہے''۔

''دل ٹھیک ہے تم اپنے دل کو وٹنس باکس میں رکھ کر گواہی دلوانا''۔ فاروقی صاحب کا انداز استہزائیہ تھا ''سر وہ بے قصور ہے''۔ لڑکی نے زور دے کر کہا۔

''سنو بے بی وہ خود کچھ بتانے پر تیار نہیں جب تک اصل حقیقت کھل کر سامنے نہ آئے میں کیا کوئی کچھ نہیں کر سکتا آخر وہ وہاں کرنے کیا گیا تھا''۔

''سر وہ وہاں صرف دیکھنے...... باقی بات اس نے ہونٹوں میں دبالی''۔

''کیا دیکھنے؟ اگر تم اس کو بچانا چاہتی ہو تو جو کچھ اس کیس کے بارے میں جانتی ہو بلا کم وکاست تفصیل سے بتادو''۔

''سر میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میرے پاپا باسط انکل کے گہرے دوستوں میں سے ہیں میرے بچپن سے دونوں گھروں میں آنا جانا ہے میں پاپا کی اکلوتی لڑکی ہوں دوسرا بہن بھائی نہ ہونے سے ندیم کے ساتھ کھیل کود کر بچپن گزارا۔ سر ندیم میرا آئڈل بنتا گیا۔ ہم دونوں ہی جانتے تھے کے ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ایک ہفتہ پہلے میں امّی پاپا کے ساتھ انکل کے یہاں آئی انکل آنٹی ممی پاپا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ میں اور ندیم لان کے اس گوشے میں بیٹھے تھے جہاں ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں کھلتی تھیں۔

''بھئی خالد میں چاہتا ہوں تم نیلم کو میری بیٹی بنادو''۔ باسط انکل کی آواز پر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا نیلم تمہاری ہی بیٹی ہے کیا تم دونوں ایسا نہیں سمجھتے تھے۔ یہ تھی پاپا کی آواز۔ وہ ہمیں بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہے لیکن خالد بھائی ہم اسے ندیم کے حوالے سے بیٹی بنانے کی بات کر رہے ہیں۔ یہ باسط انکل کی مسز کی آواز تھی۔ ''ایسا ہرگز ممکن نہیں بھابی اور یہ بات

آپ بھی بخوبی جانتی ہیں''

''آخر ندیم میں کمی کیا ہے کیریکٹر، اعلیٰ تعلیم وجاہت اس دور میں ایسے نو جوان کمیاب ہیں۔ باسط انکل نے صفائی دی۔

''مجھے ندیم کی خوبیوں سے انکار نہیں وہ بلاشبہ بہترین صفات کا حامل انسان ہے۔ مجھے اس پر بھی اعتراض نہیں ہے کہ وہ آپ کا اپنا بیٹا نہیں ہے۔ اگر وہ کسی شریف خاندان کا بچہ ہوتا تو میں سر آنکھوں پر یہ رشتہ منظور کر لیتا۔ باسط سو چو ایک ایسی کنواری ماں کا بچہ جس نے اخلاقی حدود پا رکر کے اپنے عاشق کی مدد سے پورے خاندان کو موت کی نیند سلا دیا۔ ملک میں غالباً اپنی نوعیت کا یہ پہلا ایسا کیس تھا جس کو لوگ مدتوں بھلا نہ پائے۔ ۲۰۰۸ کا وہ اخبار آخر بھی محفوظ ہے۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ عورت اور اس کا عاشق فہیم حال ہی میں عمر قید سے رہا ہوئے ہیں۔ بلکہ کچھ جاننے والوں نے بتایا ہے کہ اسی شہر میں جانسن روڈ پر فاطمہ گرس کالج کے قریب وہ عورت ایک چبوترے پر بیٹھی ہوتی ہے راہ گیر ترس کھا کر کچھ نہ کچھ دید یتے ہیں''

''میں نے نگاہیں اٹھائیں ندیم اٹھ کر جا چکا تھا''۔ لڑکی تفصیل سے بتا کر خاموش ہو چکی تھی۔

عدالتی زندگی میں ہر قسم کے سوال و جواب اور جرم سے واسطہ پڑتا ہے۔ وکیل صاحب کو سچے جھوٹے جوابوں کی اصلیت تک پہنچنے کا تجربہ تھا۔ کیس ایک کھلی کتاب کی طرح تھا۔ فہیم نامی شخص یا ندیم قاتل دونوں میں سے ایک ضرور تھا۔ انتقامی جذبہ بہر حال دونوں طرف اشارہ کرتا تھا۔

''دیکھو بیٹی کیا تم نے یہ راز کسی اور کے سامنے بھی کہا ہے'' فاروقی صاحب نے کہا۔

''نہیں کسی سے نہیں''۔ ''آئندہ کسی سے کہنا بھی مت میں دیکھونگا کہ اس کیس میں کیا کر سکتا ہوں'' عدالتی سماعت جاری ہوئی فہیم سے جرح کے دوران بار بار سرکاری وکیل مداخلت کرتے رہے۔ فہیم ٹوٹ گیا اور اقبالِ جرم کر لیا۔ دورانِ گفتگو اس نے یہ بھی کہا کہ مقتولہ کو مارنے کا فیصلہ میں نے جیل میں ہی کر لیا تھا۔ میرا مستقبل عمر کے سنہری سال اسی عورت کی وجہ سے برباد ہوئے جس نے مجھے وہ سب کرنے پر مجبور کیا تھا''۔ فہیم کو پھانسی ہوئی ندیم باعزت بری ہو گیا لیکن وہ پہلا جیسا ندیم نہیں تھا۔ کورٹ آنا لوگوں سے ملنا جلنا سب کچھ ختم ہو گیا۔ عمر قید کی سزا دنیا کے جج

کا فیصلہ تھا۔ لیکن اب جو کچھ ہوا وہ اوپر والے سب سے بڑے جج کا فیصلہ تھا اور اس کے فیصلے کبھی غلط نہیں ہوتے ہمیشہ انصاف پر مبنی ہوتے ہیں۔

فاروق صاحب اکثر اس لڑکی نیلم کے بارے میں سوچتے جس نے اس کیس میں ان کی رہنمائی کی تھی ایک روز اچانک ان کو انویٹیشن کارڈ ملا۔ یہ ندیم اور نیلم کی شادی کا کارڈ تھا۔

تقدیر کا فیصلہ

برات آگئی، برات آگئی عورتوں اور بچوں کا ملا جلا شور، گولوں اور پٹاخوں کی کان پھاڑ دینے والی آواز سنتے ہی ساری لڑکیاں بھرا مار کر اس طرح بالکنی میں بھاگیں گویا رنگ برنگی چڑیاں ایک ساتھ اُڑی ہوں ویسے بھی لڑکیوں اور چڑیوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا ہے، ہنسنا، چہچہانہ، بے فکری کبھی اِدھر تو کبھی اُدھر پل بھر میں چھت پر لمحوں میں نیچے۔ لڑکیاں بابل کے آنگن کی وہ چڑیاں ہوتی ہیں جنہیں ایک مناسب وقت پر سنہری پنجرے میں قید کر دیا جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ پنجرے سے کچھ ایسی مانوس ہو جاتی ہیں کہ پنجرے کا دروازہ لاکھ کھلا ہو وہ اڑنے کا سوچتی بھی نہیں ہیں۔

چار روز سے مانجھے بیٹھی ماہ نور مکرم صاحب کے آنگن کی خوبصورت چڑیا تھی۔ بیٹھے بیٹھے جسم اکڑ گیا تھا۔ ڈھولک کی تھاپ، تالیوں کی گونج، مہمانوں کا شور غل لڑکیوں کے فلک شگاف قہقہے، سب نے مل کر اعصاب پر ایسا اثر ڈالا تھا کہ بے طرح سر کے درد میں مبتلا کر دیا تھا۔ لڑکیوں کے جاتے ہی سوچوں کے در دا ہوئے۔ مکرم صاحب انتہائی دیندار اور نیک نفس انسان تھے کسی فیکٹری میں معمول مشاہرے پر ملازم قریب ہی نمبر ۲ کا دریچہ کھلتا ضرور تھا لیکن وہ رشوت کا ایک پیسہ لینا حرام سمجھتے تھے۔ ان کی شریک حیات نعیمہ کا بھی یہ حال تھا قناعت پسندی ہمیشہ سے شعار رہا۔ شکوہ کرنا سیکھا ہی نہیں تھا اور یہی خوبیاں انہوں نے اولاد کو وراثت میں دی تھیں۔ قدرت نے چار اولادوں سے نوازا تھا۔ سب سے بڑے سہیل جنہوں نے گذشتہ سال ایم۔اے کی ڈگری لی تھی پھر وہ یعنی ماہ نور اور اس سے چھوٹی مہوش سب سے چھوٹا نوید جو ابتدائی کلاس میں تھا۔ ماہِ نور بی۔اے کر کے گھر بیٹھ رہی کہ آگے پڑھنے کے وسائل ہی نہیں تھے۔ سہیل البتہ باپ کا بوجھ ہلکا کرنے کو جگہ جگہ جوتیاں چٹخا رہے تھے۔ اس دور میں گورنمنٹ جاب تو دور رہی پرائیوٹ جاب بھی بغیر کسی تگڑی سفارش کے نہیں ملتی۔ ماہِ نور خوبصورت نیک سیرت سلیقہ مند تھی لیکن اس کے ساتھ بھی وہی المیہ تھا جو اس کلاس کی لڑکیوں کے ساتھ عموماً ہوتا ہے۔ مکرم صاحب شاندار جہیز کہاں سے

لاتے معمول انکم کے علاوہ چند بیگہ زمین کا ٹکڑا تھا جس سے سال کے سال غلہ ہو جاتا رشتہ آتے رہے۔ گھر کی حیثیت دیکھ کر اور ناشتہ زہر مار کر کے کبھی نہ آنے کے ارادے سے رخصت ہو جاتیں کسی کو اُس کا حُسن سلیقہ اور تعلیم متاثر نہیں کرتی کہ یہ سب تو اس دور کی ثانوی چیز ہے۔ حساس ماہِ نور اس نمائشی میلے سے بری طرح تنگ آ چکی تھی۔ آخر کار مکرم صاحب کے ایک دوست کی وساطت سے عُبید کے رشتہ پر مہر لگ گئی۔ معمول شکل وصورت گہری سانولی رنگت چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ایک مقامی بینک میں کیشیر تھا۔ دیکھنے میں شریف لوگ لگے سب سے بڑھ کر جہیز کا کوئی خاص مطالبہ نہیں تھا نعیمہ بیگم نے ایک سگھڑ ماں کی طرح برسوں سے بیٹی کے جہیز کے لیے ہلکی پھلکی تیاری شروع کر دی تھی۔ کوئی میرج ہال بک نہیں کیا گیا تھا۔ گھر سے باہر خالی جگہ میں پنڈال لگا دیا گیا تھا۔ سہیل نے اپنے دوست ہمایوں کی مدد سے شامیانے قناطیں اور دیگر سجاوٹ سے میرج ہال بنا دیا۔ دیگر خاندان اور جان پہچان کے لڑکے بھی انتظام میں پر جوش تھے۔

ہمایوں ایک جانے مانے بزنس مین کا اکلوتا بیٹا ہونہار لائق امیری غریبی کے زبردست فرق کے باوجود اپنے جگری دوست سہیل کو حقیقی بھائی کی طرح چاہتا تھا۔ کسی موقعہ پر اس نے سہیل کی مدد کرنا چاہی لیکن سہیل کی خودداری نے کبھی قبول نہیں کی۔ سہیل کے پاس برابر آتا جاتا رہتا تھا۔ ماہِ نور سے کئی بار اتفاقیہ سامنا ہوا۔ ماہِ نور کے سینے میں ایک گوشت کا لوتھڑا تھا جسے دل کہتے ہیں جو ہر خوبصورت چیز دیکھ کر ہمکتا ہے۔ لیکن بس ایک لمحے کو وہ مشرقی لڑکی اچھی طرح آگاہ تھی کہ آسماں کا چاند خاک نشینوں کی جھولی میں نہیں اتر سکتا۔

لڑکیاں برات اور دلہا کا نظارہ کر کے واپس آ چکی تھیں۔ تبصرے شروع ہو چکے تھے ماہِ نور بھی حال میں لوٹ آئی۔

''بھئی ایمان کی بات ہے دولہا ہماری ماہِ نور کا پاسنگ بھی نہیں''۔ ماموں زاد زارا نے خیالات کو الفاظ دیے۔

''مجھے تو ساس نندیں بھی نک چڑھی لگیں''۔ ایک اور تبصرہ آیا۔

''بھئی کیوں پہلے سے میری آپی کا دل خراب کر رہی ہو''۔ مہوش نے دخل اندازی کی۔

''بھئی جیسا دیکھا ویسا کہدیا''۔ زارا کو مہوش کی دخل اندازی اچھی نہیں لگی۔

''زارا آپی آپ اچھا بُرا دیکھ رہی ہیں ہم مڈل کلاس فیملی کی لڑکیاں عزت سے اپنے گھر کی ہو جائیں یہ کیا کچھ کم ہے''۔ مہوش نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

حسب دستور بڑی عزت واحترام سے دولھا والوں کو کھانا کھلایا گیا۔ ہر ایک چاق وچوبند تھا کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے کسی کو شکایت نہ ہو۔ کھانے سے فارغ ہو کر لڑکے والوں نے جہیز دیکھنے کی فرمائش کی جو برابر کے پنڈال میں سجا ہوا تھا۔

''بھئی جہیز تو بڑا معمولی ہے کوئی قیمتی چیز نظر ہی نہیں آ رہی ہے''۔ لڑکے کے ماموں کی جانب سے پہلا پتھر آیا۔ ''ضرورت کی مکمل اشیاء بھی نہیں ہیں''۔ یہ بھی غالباً کوئی ماموں یا چچا قسم کی چیز تھے۔

''محترم آپ کے یہاں سے کسی قسم کی کوئی فرمائش نہیں تھی پھر بھی میں نے جو کچھ کیا ہے وہ اپنی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر کیا ہے''۔ مکرم صاحب نے نرمی سے کہا۔

''آپ بھی کیا بات کرتے ہیں، کیسی فرمائش، کلر ٹی۔ وی، فرج، واشنگ مشین، بائک یہ تو عام ضرورت کی اشیاء ہیں۔ ہمیں فرمائش کرنا ہوتی تو کار یا فلیٹ کی کرتے''۔ لڑکے کے والد نے انتہائی سرد مہری سے کہا۔ شجاعت صاحب جن کے توسط سے رشتہ طے ہوا تھا قریب آ گئے۔

''محترم آپ ہی سمجھایئے میں نے آپ سے پہلے ہی اپنی حیثیت واضح کر دی تھی''۔ مکرم صاحب نے کہا شجاعت صاحب نے کچھ کہنے کو منھ کھولا ہی تھا کہ دولھا کے والد توہین آمیز لہجے میں بول پڑے ''اجی یہ کیا سمجھائیں گے ہمارے ساتھ سراسر دھوکا ہوا ہے''۔

''کیسا دھوکہ ہم نے آپ کو کوئی دھوکہ نہیں دیا''۔ ہم اپنی خوبصورت تعلیم یافتہ سلیقہ مند بہن کو آپکی شرافت پر یقین کر کے رشتہ پر راضی ہو گئے یہ دھوکا ہے''۔ سہیل باپ کی توہین برداشت نہ کر سکا۔ دونوں طرف کے کافی لوگ اکٹھا ہو گئے۔ مکرم صاحب کا رنگ متغیر تھا کہ دولھا کے وہی پہلا پتھر پھینکنے والے ماموں دولھا کے والد کو الگ لیجا کر کچھ سرگوشیاں کرتے رہے۔

''ہم نے سنا ہے آپکی کچھ زمین بھی ہے''۔ دولھا کے والد نے مکرم صاحب سے کہا۔

''آپ نے صحیح سنا ہے پھر؟''

''پھر یہ کہ ہم صرف اس شرط پر آپکی لڑکی کو نکاح کر کے لیجائنگے کہ آپ اس زمین کو

فروخت کر کے جہیز کی کمی کو پورا کرینگے"۔ ورنہ..........

"ورنہ سے آگے سوچنا بھی ایک عزت دار باپ کے لیے موت سے بدتر مقام ہے"۔

"ٹھیک ہے"۔ اثباتی جواب تھا۔

اندر خواتین میں بھی زبردست بے چینی گوئیاں ہورہی تھیں حساس ماہِ نور کو لگا وہ آہستہ آہستہ زمین میں دھنستی جارہی ہے۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ ایک خیال بجلی کی طرح ذہن میں آیا اور وہ مطمئن ہوگئی۔

"تمھیں بہ عوض پچیس ہزار روپیہ مہر معجّل عبدالرحمٰن کے نکاح میں دیا جاتا ہے تمھیں قبول ہے"۔ کوئی آواز نہ پا کر گواہاں نے دوبارہ الفاظ دہرائے کمرے میں مکمل سکون تھا۔ انتظار تھا تو صرف ایک مجبور "ہاں" کا۔ لیکن یہ کیا۔ "نہیں"۔ ماہِ نور کی آواز نے ایک خاموش طوفان کو آواز دی گواہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ حیرت، استعجاب، ملامت، کتنی ہی نظریں اٹھیں۔ نعیمہ بیگم جلدی سے آگے بڑھیں۔ "بیٹی کیا کہہ رہی ہے"۔ "امّی مجھے مہر کی رقم پر اعتراض ہے"۔

"مہر عورت کا حق ہوتا ہے تمھیں کتنے مہر پر نکاح قبول ہے"۔ مولوی صاحب نے بات کو مختصر کیا۔ "پانچ لاکھ"۔ ماہِ نور نے میزائل داغا۔

ماہِ نور ہوش میں تو ہے کیوں ہماری عزت کا جنازہ نکالنا چاہتی ہے۔ نعیمہ بیگم نے بیٹی کو جھنجوڑا۔ "مہوش جلدی سے باپ بھائی کو بلا کر لائی یہ پاگل ہوگئی ہے"۔ مکرم صاحب اور سہیل نے کمرے میں قدم رکھا۔ جو کچھ سنا وہ ناقابلِ یقین تھا انہیں اولاد کی تربیت پر ناز تھا پھر کہاں کمی رہ گئی۔ سہیل البتہ خاموش کھڑا تھا۔ مکرم صاحب بیٹی کے قریب آئے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "ماہِ نور یہ سب لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟"

ماہِ نور تڑپ کر باپ کے سینے سے لگ کر بے تحاشا رو پڑی۔ پاپا مجھے غلط مت سمجھئے میں آپکی عزت کی خاطر جان بھی دینے کو تیار ہوں نہ میری کوئی پسند ہے آپ نے جو میرے لیے سوچا میں نے ہامی بھر لی۔ لیکن جہیز کے لالچی بھری محفل میں آپ کو ذلیل کریں اور دو ڈھائی بیگھہ زمین کا بھی سودا کریں پاپا یہ مجھے منظور نہیں وہ اپنا حق استعمال کر سکتے ہیں تو میں بھی کر سکتی ہوں میں ایسی زندگی سے مرجانا پسند کرونگی جب رخصت ہوتے ہوئے ماں باپ اور بہن بھائی کے منہ سے نوالہ

بھی چھین لوں۔ آپ جس کے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھمائینگے مجھے منظور ہے۔ آپکی عزت سے پیاری مجھے کوئی چیز نہیں ہے سیکڑوں لوگوں کے درمیان میں آپ کا جھکا سر نہیں دیکھ سکتی''۔ روتی بلکتی ماہِ نور نان اسٹاپ بول کر باپ کے بازؤں میں بیہوش ہوگئی۔ خاموش کھڑے سہیل نے آگے بڑھ کر اس کو آہستگی سے لٹا دیا۔

''محترم آپ کی بیٹی نے بہادری سے ایک قدم اٹھایا ہے آج آپنے زمین فروخت کر نے کا وعدہ کیا ہے۔ کل لڑکی کو گھر لے جا کر ان کے مطالبات مزید بڑھے تو کیا آپ رہائشی مکان فروخت کر کے ان کی فرمائش پوری کرینگے۔ اور پھر آپکی دوسری بچی بھی تو ہے''۔ گواہان میں سے ایک نے کہا۔

مردانہ محفل میں آکر گواہان نے دولھا کے والد کے سامنے ماہِ نور کا مہر کا مطالبہ دہرایا۔

پانچ لاکھ سنتے ہی وہ اپنی سیٹ سے غالباً پانچ فٹ ہی اچھل پڑے۔ ''اوہ تو لڑکی کو یہ شادی منظور ہی نہیں ضرور کہیں کوئی چکر ہے''۔ ایک معصوم اور پارسا لڑکی کے بارے میں گل افشائی کی۔ '' آگے ایک لفظ نہیں ورنہ نتیجے کے ذمہ دار آپ خود ہونگے میری معصوم بہن پر الزام لگاتے شرم نہیں آتی آپ بیٹے کی شادی کر رہے ہیں یا تجارت آپکی فرمائش پر ہم اپنی زمین بیچ دیں اور آپ پانچ لاکھ کا نام سنتے ہی آپے سے باہر ہو جائیں''۔ سہیل کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ہمایوں نے آگے بڑھ کر سہیل کو روکا۔

''پاپا چلئے ہم کہاں پھنس گئے''۔ دولھا میاں نے مسند سے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔
برات واپس جانے لگی۔ مکرم صاحب جلدی سے آگے بڑھے ہی تھے کہ سہیل نے انہیں شانوں سے تھام کیا۔ ''پاپا یہ لالچی لوگ میری پھول سی بہن کے قابل نہیں ہیں''۔

بیٹا کیا کہہ رہے ہو روک لو انہیں اب کون آئگا میرے دروازے پر میں کسی کو منھ دکھانے کے قابل نہیں رہونگا۔ لہجہ ٹوٹا بکھرا تھا۔ ''لوگ انہیں کچھ نہیں کہہ نگے کہ یہ تو رسم ورواج ہے۔ میری بچی کہیں کی نہیں رہے گی''۔ ان کی آنکھوں سے دو آنسو گر کر گریبان میں جذب ہو گئے۔ ''سہیل اپنے مہمانوں کو روکے رکھو ماہِ نور آج ہی رخصت ہوگی میں ابھی آیا''۔ ہمایوں کے کہنے پر دونوں باپ بیٹے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہمایوں کو غور سے دیکھا۔

آدھے گھنٹے میں شاندار سیاہ گاڑی گیٹ پر رکی۔ ہمایوں نے اتر کر گیٹ وا کیا زماں خاں اور ان کی بیگم گاڑی سے باہر آئے۔ زماں خاں سیدھے مکرم صاحب کے پاس آئے رسمی علیک سلیک کے بعد وہ انہیں ایک طرف لے گئے۔ ''ہمایوں آپکی نظر میں کیسا ہے''۔ بغیر تمہید کے استفسار کیا۔ ''لاکھوں میں ایک لیکن آپ مجھ سے کیوں دریافت فرما رہے ہیں''۔ مکرم صاحب کی حیرت بجا تھی۔

''اس لیے کہ میں اسے آپکی فرزندگی میں دینا چاہتا ہوں اگر آپکو یہ رشتہ منظور ہے تو میں آج ہی ماہِ نور کو رخصت کرا کر لے جانا چاہتا ہوں''۔

''سیٹھ صاحب یہ آپکی وسیع القلبی ہے لیکن میرا اور آپکا کیا جوڑ ہمایوں کی سہیل سے دوستی ضرور ہے لیکن شادی بیاہ برابر والوں میں ہی ہوتے ہیں پھر آپکا اکلوتا بچہ نہ معلوم آپکے دل میں کیا کیا ارمان ہونگے''۔ دولت کے آگے ایک باپ کے الفاظ سرنگوں تھے۔

''بس مکرم صاحب آگے ایک لفظ نہیں دولت کی ترازو سے شرافت کو مت تولیے آپ کی بچی نے ایک مثال قائم کی ہے جہیز کے لالچیوں کے منہ پر تمانچہ مارا ہے مجھے اس سے اچھی بہو نہیں مل سکتی۔ ہمایوں کی سالگرہ پر وہ ایک بار ہمارے یہاں آئی تھی ہم دونوں میاں بیوی کو وہ بے حد پسند آئی تھی لیکن آپکے یہاں رشتہ پکا ہونے کا سُن کر ہم نے خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن تقدیر کا یہ فیصلہ ہے''۔ اگر آپ کا یہی فیصلہ ہے تو میں بخوشی یہ رشتہ منظور کرتا ہوں مکرم صاحب کی خوشی دیدنی تھی۔ اندر بیگم زماں روتی ہوئی ماہِ نور کو سینے سے لگائے تسلی دے رہی تھیں۔

سب کچھ ویسا ہی تھا بس دولھا بدل چکا تھا جس مسند پر کچھ دیر قبل عبدالرحمٰن گردن اکڑائے بیٹھے تھے وہاں اب ہمایوں تھا۔ اکیاون ہزار مہر کے عوض ماہِ نور کا نکاح ہمایوں سے ہوا۔ ہر طرف مبارک سلامت کا شور تھا۔ زماں صاحب مکرم صاحب سے گلے لگ گئے۔ سچ ہے جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ مکرم صاحب اور سہیل نے جہیز لے جانے کی بات کی ''نہیں بھائی ہم ایک تنکا بھی یہاں سے نہیں لے جائنگے یہ آپ دوسری کے لیے رکھئے۔ اصل جہیز تو خود ماہِ نور بیٹی ہے دیر رات ماہِ نور رخصت ہوئی۔ گاڑی میں ماہِ نور کے برابر بیٹھے ہمایوں نے آہستہ سے سرگوشی کی ''ماہِ نور مہر قبول ہے''۔ اس کا جھکا سر کچھ زیادہ ہی جھک گیا۔

بنت حوا کے تین روپ

وہ عمر کے اس دور میں تھی جہاں زندگی بھر کے سود وزیاں چہرے پر رقم ہو جاتے ہیں۔ بنتِ حوا کی تقدیر کے عموماً تین روپ ہوتے ہیں پہلا پیدائش سے لیکر بابل کی دہلیز سے رخصتی کا دور دوسرا اس کی ازدواجی زندگی کا دور اور تیسرا اور آخری بڑھاپے کا وہ دور جب وہ مکمل طور پر اولاد کی دستِ نگر ہوتی ہے۔ انہیں تین روپوں کی روشنی میں وہ اپنی زندگی کا محاسبہ کر رہی تھی۔ اس کے حصے میں ہر دور میں زیاں آئے تھے سود کا دور تک نام ونشاں نہیں تھا۔

اس کی بے نور آنکھیں دور تک ماضی و حال کو دیکھ رہی تھیں۔ رہا مستقبل، مستقبل ایک بند گلی تھا۔ ایک ڈیش اور آگے تین حرفی لفظ ''موت'' اس نے زندگی میں کیا کھویا، کیا پایا۔ اس کی جھولی خالی تھی۔ وہ ایک دیندار سفید پوش گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔ گھر کی پہلی بیٹی تھی لیکن اس کی پرورش اس انداز میں ہرگز نہیں ہوئی جیسی کہ ہونا چاہیے تھی۔ شعور کی آنکھ کھلتے ہی اس نے محسوس کر لیا کہ اس کے والدین خاص کر ماں کو بیٹا چاہیے تھا۔ وہ ایک ناپسندیدہ ہستی ہے۔ وہ بچپن ہی سے اپنے خول میں سمٹ گئی۔ گھر میں ماں کے علاوہ دادی چچی وغیرہ بھی تھیں لیکن ماں گھر کی بے تاج بادشاہ تھیں۔ ان سب کی زیرِ نگرانی اس کا بچپن بیتنے لگا۔ جوں جوں وہ بڑی ہوئی کئی بے جا روک ٹوک کڑی تنقید ہر حرکت پر قدغن۔

''ڈوپٹہ ٹھیک سے اوڑھو'' ''صحن میں بال کھول کر کیوں کھڑی ہو''۔ شام کو چھت پر کیوں گئی تھیں''۔ ''یہ کیسی گھوڑے جیسی چال ہے آہستہ قدم اٹھاؤ''۔ شباب کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی نظروں کے پہرے سخت ہونے لگے۔ اس میں خود اعتمادی کی کمی آتی گئی وہ سوچتی کہ وہ محض ایک کٹھ پتلی ہے جس کی ڈور دوسروں کے ہاتھوں میں ہے جبکہ اس کے خاندان کی دوسری لڑکیاں ان بے جا بندشوں سے ایک حد تک آزاد تھیں۔ لیکن اسے کسی سے کوئی شکوہ شکایت نہیں تمام پابندیاں روٹین میں شامل ہو گئی تھیں۔ وہ کہیں آتی جاتی نہیں تھی اس کی اگر کسی سے دوستی اور بے تکلفی تھی تو وہ تحریم تھی بڑے چچا کی بیٹی جس کا گھر تھوڑے فاصلے ہی پر تھا۔ وہ دل کی تمام باتیں تحریم سے کر لیا

کرتی تھی۔ حالانکہ ابھی اس کا دل کورے کاغذ کی مانند تھا جس پر نہ کسی کا نام تھا نہ تحریر۔ لیکن وہ دور شروع ضرور ہو چکا تھا جب دل ایک اور محبت کی تمنا کرنے لگتا ہے۔ خوابوں اور خیالوں کی دنیا ایک ان دیکھے ساتھی کے تصور سے مہک اٹھتی ہے۔ ایک حسین شہزادہ پریوں کے دیس سے آئیگا اور اپنے سنہرے رتھ پر سوار کروا کر لے جائے گا وہ کوئی انوکھی نہیں تھی۔ کچی عمر کی ہر لڑکی کا یہ خواب ہوتا ہے۔

پھر اس کے خوابوں نے جلدی ہی حقیقت کا روپ دھار لیا۔ خاندان کی کسی شادی کی محفل تھی وہ بھی تقریب کی مناسبت سے سج دھج کر گئی۔ ''وہ نوجوان کتنے انہماک سے تجھے دیکھ رہا ہے''۔ تحریم نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کون؟'' مجھے کیوں دیکھ رہا ہے۔ اس نے نظریں اٹھائیں پل بھر کو دونوں کی نظریں ملیں۔ اس کے دل نے دھڑک کر پہلی گواہی دی۔ وہ تو اس کے تصوراتی شہزادے سے بھی کہیں زیادہ حسین اور باوقار تھا۔ حُسن کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو کر شہزادوں نے تخت و تاج ٹھکرا دیے ہیں وہ تو ایک معصوم گھریلو ٹائپ لڑکی تھی۔ اس کا دل نوجوان کے تصور سے آباد ہو گیا۔ وہ کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ نوجوان نے کس طرح اس کا پتہ ٹھکانہ معلوم کیا وہ لاعلم تھی۔ نہ انمیں خط کتابت ہوئی، نہ چھپ چھپ کر ملاقاتیں۔ سیدھے شریفانہ طریقے سے ایک بزرگ رشتہ لیکر آئے۔ خوبرو اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ایسے رشتے قسمت سے ملتے ہیں گھر والوں کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں انگوٹھی جگمگانے لگی۔ اس کے چہرے پر گلاب کھلنے لگے۔ آنکھوں میں کہکشاں اتر آئی۔ اس کی سادہ بد رنگ زندگی کتنی حسین ہو گئی بہاریں گنگنا اٹھیں در و دیوار رقص کرتے نظر آنے لگے۔ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا وقت بھی بڑی ظالم شے ہے خوشی میں تیز رفتار خرگوش کی مانند چھلانگیں مارتا ہے اور دکھ میں کچھوے کی طرح سست رفتار ہو جاتا ہے ایک سال گزر گیا پتہ ہی نہ چلا۔

وہ رات کو پانی پینے اٹھی دادی کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی امی پاپا اور دادی کی آوازیں آ رہی تھیں اپنا نام سن کر تجسس نے سر ابھارہ وہ دبے پاؤں آگے بڑھی اور دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ''اے لو یہ نیا شوشہ چھوڑا ہم کب تک لڑکی بٹھائے رکھیں گے''۔ دادی کی آواز۔

''وہ دراصل باہر کوئی کورس کرنے جانا چاہتا ہے''۔ پاپا نے تشریح کی۔

''اماں ٹھیک تو کہہ رہی ہیں اب مزید دو سال ہم لڑکی کو بٹھائے رکھیں گے''۔ یہ امی کی

گلفشانی تھی۔ ''پھر کیا کرنا چاہیے؟'' پاپا نے استفسار کیا۔

''کرنا کیا ہے صاف منع کردو''۔ دادی نے مشورے سے نوازا۔ ''اماں دل نہیں مانتا لڑکا خوبصورت ہے خاندانی ہے اور سب سے بڑی بات اکیلا ہے۔ اور پھر زبان بھی کوئی چیز ہوتی ہے''۔ پاپا نے کشتی کو اچھالا دیا۔ ''انہوں نے زبان کا کب پاس کیا ایک سال کا کہا تھا پھر مکر گئے''

''انہوں نے انکار تو نہیں کیا''۔

''میاں تمھاری اولاد ہے تم جانو میری تو پہلے ہی خوشی نہیں تھی۔ صورت کا کیا ہے مرد کی صورت نہیں دولت دیکھی جاتی ہے لڑکی راج کرلے کتنے ارمانوں سے سیٹھ واجد رشتہ لیکر آئے تھے دولت ان کے گھر کی باندی ہے سونے میں پیلا کر کے تمھاری بیٹی لے جاتے''۔

''لیکن اماں ہاشم کی نہ تو تعلیم ہے نہ ہی کچھ کرتا دھرتا ہے۔ سنا ہے ماں بھی بہت تیز اور بدزبان ہے''۔ ''اسے کچھ کرنے دھرنے کی ضرورت بھی کیا ہے باپ کے پاس کم دولت ہے سات پشتیں بیٹھ کر کھائینگی تب بھی کم نہیں ہوگی رہی تعلیم تو تمھاری بیٹی کیا کتابیں چاٹے گی''۔

''اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں میری مانیے تو انہیں ہاں کہہ دیں بچی سونے میں پیلی موتیوں میں سفید ہوکر راج کریگی اور سب سے بڑی بات واجد صاحب نے جہیز کو بالکل منع کردیا ہے ہم سستے چھوٹ جائینگے۔ اس کے لیے جوڑا جہیز دوسری کے کام آئیگا''۔

اس میں مزید سننے کی تاب نہیں تھی اسے لگا زمین کی گردش رک گئی ہو۔ اس کے پیر زمین نے جکڑ لیے ہوں ہر طرف آندھی کا غبار جس نے اسے بری طرح چھاپ لیا بمشکل اس نے پورا زور لگا کر زمین کی گرفت سے اپنے پیر آزاد کیسے کسی نہ کسی طرح اپنے بکھرتے وجود کو گھسیٹ کر کمرے تک لائی۔ رات کس طرح گزری یہ کچھ وہی جانتی تھی۔ صبح اسے تیز بخار تھا۔ ایک ہفتہ بیت گیا۔ لگتا تھا وہ سماعت و بصارت سے محروم اندھی، گونگی بہری ہوگئی ہو خواہشوں سے میرا جذبات سے عاری اس کے دکھ کا اندازہ اگر کسی کو تھا تو تحریم تھی۔ اسکی ہمدرد غمگسار۔

''تم کوئی کھلونا نہیں ہو جس سے اس کے اپنے کھیل رہے ہوں شرع اور قانون دونوں نے تمھیں پسند کا حق دیا ہے۔ اس کا استعمال کرو''۔

''نہیں نہیں میں ہرگز ایسا نہیں کرسکتی''۔ اس کی فطری بزدلی عود کر آئی۔

''کیوں نہیں کر سکتی کہو تو میں چچا چچی سے بات کروں''۔تحریم بضد ہوئی۔

''نہیں خدا کے لیے نہیں تحریم میں باپ کی اٹھی ہوئی گردن نہیں جھکا سکتی۔باپ کی پگڑی پیروں میں روندنے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے''۔''اور نہ ہی اپنی پاکیزہ محبت کی رسوائی گوارا ہے''۔پھر وہی ہوا جو گھر والے چاہتے تھے۔

تیری آرزو، میری جستجو، میری خواہش اب کچھ بھی نہیں
مرا خواب مثلِ گلاب تھا جو خزاں ہوئی تو بکھر گیا

اس کے زندہ وجود کو سونے کے گنبد کے نیچے دفن کر دیا گیا۔اس کے ٹوٹے دل کی صدائیں کسی کے کانوں تک نہیں پہنچی۔

اب وہ ہاشم کی بیوی تھی یہ زندگی کا دوسرا روپ تھا۔ہاشم جو ایک سخت گیر ظالم اور اوباش نوجوان تھا ڈال ڈال پر منڈلانا اس کی فطرت تھی۔شراب کا بھی رسیا تھا۔پہلے دن ہی سے اس نے اپنی طبیعت کے جوہر دکھانا شروع کر دیے۔اسے باپ پر بھی بیحد غصہ تھا جو امیر زادیوں کو چھوڑ کر ایک بغیر جہیز کی بھکارن اس کے لیے بیاہ لایا تھا۔شاید اس بات سے لاعلم تھا کہ عزیز رشتہ دار اور جان پہچان کے لوگ اس کا نام سن کر کانو پر ہاتھ رکھتے۔گزرتے وقت کے ساتھ اس کی ازدواجی زندگی ایک ایسا پل صراط بن گئی جس پر چل کر اس کے پیر فگار ہو گئے نفرت کا اندھیرا، مصائب کے بادل، ستم کی بجلیاں اور ان کے درمیان اس کا ناتواں وجود اب وقت نے اسے ماں بنا دیا۔ماں ہونا جو ایک عورت کی معراج ہے۔شاید اس کا شوہر بچوں کی محبت میں اس تک لوٹ آئے امید جاگی۔لیکن ہاشم کو بچوں سے بھی کوئی لگاؤ نہیں تھا۔بلکہ اس کو ذہنی اذیت دینے کا ایک نیا طریقہ ہاتھ لگا وہ اس کے سامنے معصوم بچوں کو ٹارچر کرتا اور وہ تڑپ جاتی۔

اب وہ پچھلی زندگی بھولتی جا رہی تھی اس نے اپنے کو بچوں میں گم کر دیا۔لیکن تقدیر کو ابھی اور امتحان مقصود تھے۔شراب کے بے تحاشا استعمال نے ہاشم کے پھیپھڑے ناکارہ کر دیے تھے غلط صحبت نے بھی اپنا رنگ دکھایا تھا۔اس کی شادی یا با الفاظ دیگر بربادی کی چوتھی سالگرہ اس کی بیوگی سے ہوئی۔ہاشم برا بھلا جیسا بھی تھا بچوں کے سر پر نام کا ہی سہی سایہ تو تھا۔ابھی اس افتاد سے سنبھلنے بھی نہیں پائی تھی کہ گھر والوں کے فیصلے نے اس کو لرزا کر رکھ دیا۔

''جب ہمارا بیٹا ہی نہیں رہا تو اس منحوس ڈائن کا یہاں کیا کام''۔ ساس کے الفاظ تھے۔

''اماں چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو لے کر کہاں جاؤں''۔ اس نے التجا کی۔

''کیوں ماں باپ مر گئے کیا؟'' اصل میں یہاں جیسا عیش و آرام ان بھک منگوں میں کہاں ملے گا''۔ یہ ہاشم کی بہن کا ریمارک تھا۔

''عیش، عیش اس نے اپنے ہاتھوں اور بازوؤں پر نظر ڈالی جہاں بیشمار کالے داغ تھے جو اس کے عیش کی گواہی دے رہے تھے۔ دراصل ہاشم کا اسکو سوتے سے جگانے کا عجب انداز تھا وہ جلتے سگرٹ کا داغ لگا کر اس کو بیدار کرتا۔

اس نے منت سماجت کی روئی پیٹی لیکن معصوم بچوں کے ہمراہ دھکے دے کر اس کو دہلیز سے نکال دیا گیا تھا جہاں وہ دلھن بن کر آئی تھی۔ زمین سخت آسمان دور کے مصداق وہ اب کیا کرے۔ جس گھر سے رخصت ہو کر آئی تھی وہ باپ کا گھر تھا۔ جس دہلیز سے اب نکالا گیا وہ شوہر کا گھر تھا۔''یا خدا آخر اس کا گھر کہاں ہے کس سے معلوم کرے اس کی فریادی نظریں بے اختیار آسماں کی جانب اٹھ گئیں۔ وہ ایک بار پھر باپ کے گھر پر آ گئی جہاں سب اس کے اپنے تھے۔ چند روز اس کی دلجوئی کی گئی پھر اسے بچپن کے اس گہوارے میں بیگانیت کا احساس ہونے لگا۔

''یہاں اپنا اور بچوں کا گزارہ مشکل ہے اوپر سے تین جانوں کا بوجھ''۔ یہ اس کی بھاوج تھی حقیقت میں وہ بوجھ ہی تھی زمین کا بوجھ۔ ڈال سے ٹوٹا پتہ راستہ چلنے والوں کے قدموں تلے ہی روندا جاتا ہے۔''بھابی میں اپنا اور بچوں کا بوجھ محنت مزدوری کر کے اٹھا لونگی پر چھت کا آسرا دیدو''۔ اس نے لجاہت سے کہا پھر اس کو چھت کا اسرا مل گیا۔ باپ کے چار سو گز کے مکان کا سب سے چھوٹا کمرا جو اسٹور کے کام آتا تھا۔ اسے احسان سمجھ کر دے دیا گیا۔ اور سب اس کی طرف سے لاپرواہ ہو گئے۔ صرف ایک تحریم تھی جو اس کی دلجوئی کرتی جس کے کاندھے پر سر رکھ کر وہ دل کی تپش کو راہ دے دیتی۔ تحریم اب خود شادی شدا اور دو بچوں کا ماں تھی اسے مستقل اپنے گھر لے جانا چاہتی تھی لیکن اس نے سہولت سے انکار کر دیا۔ وہ کوئی نیا الزام اپنے سر لینا نہیں چاہتی تھی۔ اب وہ سوچتی زندگی کے دو بدنما رخ و روپ وہ دیکھ چکی ہے لیکن آنے والا دور اس کا ہوگا اس کے بچے جن کی پرورش و پرداخت میں وہ اپنا تن من وار رہی ہے کل کو بڑے ہو جائینگے تب وہ راج کریگی ان

کی ٹھنڈی چھاؤں میں زندگی کی تھکن مٹائے گی۔ راج پر اسے یاد آیا اس کی ماں نے ہمیشہ شوہر کے گھر پر راج کیا۔ لیکن اس نے بجائے راج کے لونڈی سے بدتر وقت گزارا۔

پھر وہ وقت بھی آ گیا جس کے لیے اس نے برسوں ریاضت کی تھی امید کے پودوں میں کلیاں آنا شروع ہو گئیں اس کے بچے بڑے ہو گئے۔ وہ زندگی کے آخری دور میں داخل ہو گئی۔

''اماں زندگی ہماری ہے ہمیں جینے دو''۔ ایک آواز۔ تم سے کس نے مشورہ مانگا ہے ہمیں تمھارے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے بس دو وقت روٹی کھاؤ اور ایک طرف بیٹھی رہو''۔ دوسری آواز ''اصل میں مفت کھانے کو مل رہا ہے تو باتیں سوجھ رہی ہیں''۔ ''اماں تم ماں نہیں ڈائن ہو پہلے ہمارے باپ کو کھایا اور اب ہمارا جینا حرام کیے ہو''۔ یہ الفاظ صبح سے شام تک اس کی سماعت سے ٹکراتے اس پر بس نہیں وہ آپس میں دست و گریباں ہوتے وہ خاموش تماشائی بنی رہتی۔ ہر بیٹے کو شکوہ ہوتا کہ ماں دوسرے کو اس پر حاوی کرانا چاہتی ہے۔ وہ اپنی صفائی میں ایک لفظ کہنے کا حق نہیں رکھتی تھی یہ کیا ہو گیا؟ اس کی تربیت میں کہاں کمی رہ گئی شاید وہ یہ بھول گئی تھی کہ لہو اپنا رنگ ضرور دکھاتا ہے عورت تو مثل زمین کے ہے نیم کا بیج بو کر آم کہاں سے آئینگے۔

وہ بیٹی بن کر تقدیر کا نشانہ بنی رہی، بیوی بن کر ظلم کی چکی میں پستی رہی اور اب زندگی کا تیسرا اور آخری روپ۔ وقت کے سیلاب میں اس کی ہر آرزو بہہ گئی تھی۔ صرف دل کی طاق میں درد کا جلتا دیا روشن تھا۔

پھر اس کی زندگی جو اِن اللہ مَعَ الصابرین سے شروع ہوئی تھی انا للہ وانا الیہ راجعون پر ختم ہو گئی۔ صحن میں جنازہ رکھا تھا۔ اس کے بیٹے بے تحاشا رو رہے تھے۔

''ہائے ہماری دُعا کا دروازہ آج بند ہو گیا''۔ ''اب ہمیں سیدھی راہ کون دکھائے گا۔ ہائے کس سے مشورہ لینگے''۔ اس کی بھاوج کا بھی حال تباہ تھا۔ ''میں نے تو باجی کو ہمیشہ بڑی بہن سمجھا۔ بھائی بھی ایک طرف کھڑا گھڑیالی آنسو بہانے میں مشغول تھا۔

''ہم اماں کی قبر پر سنگِ مرمر لگوائینگے'' اور سرہانے گلاب اور موتیا کے پیڑ لگاؤنگا۔ دوسری آواز۔ ''میں نے ایک حافظ صاحب سے بات کر لی ہے وہ چالیس روز تک قبر پر تلاوت کرینگے اماں کی روح کو سکون ملے گا''۔

تف ہے ایسی منافقت پر

وہ ان سب آوازوں اور ایمارکس سے آزاد ہو کر غالباً بارگاہ خداوندی میں گزری زندگی کا حال سنانے میں مصروف تھی۔

ذات کا کرب

ہر چیز پرانی ہو کر اپنی رعنائی اور زیبائی کھو دیتی ہے۔ فلک بوس عالیشان عمارات جن کی بناوٹ اور تعمیر میں سیکڑوں فنکاروں کا ہاتھ ہوتا ہے جو فن تعمیر کا بیش قیمت نمونہ ہوتی ہیں وقت کے ہاتھوں سالخوردہ ہو کر کس قدر بد ہیبت ہو جاتی ہیں اکھڑی اینٹیں کسی انسانی ڈھانچے کے بدنما دانتوں کی طرح اپنی نمائش پر شرمندہ ہو کر سرنگوں جاتی ہیں سرسبز شاداب گھنیرے درخت جن کی ٹھنڈی چھاؤں میں سیکڑوں مسافر سکون اور راحت پاتے ہیں جب بوڑھے ہو کر اپنی تازگی اور شادابی کھو دیتے ہیں ان کی کھوکھلی جڑوں کو موسم بہار کی رت بھی تازہ کر کے بار آور نہیں کر سکتی وہ کھوکھلے ہو کر زمین بوس ہو جاتے ہیں۔

کچھ یہی حال انسانی زندگی کا ہے یکساں رفتار سے چلتے چلتے آخر کار انسان شانوں کا بوجھ بن جاتی ہے سانسوں کی آمدورفت زندہ رہنے کا پتہ دیتی ہے۔

میں شروع سے ایک کہانی کار تھی بلکہ ہوں۔ بحیثیت ایک تخلیق کار میری ایک پہچان ایک شناخت ہے لوگ مجھے پڑھتے ہیں پسند کرتے ہیں سیکڑوں تاریفی خطوط ملتے ہیں۔ یہ تعریفیں ہی شاید ایک تخلیق کار کا سرمایہ ہوتی ہیں میرے ساتھ وہی ہوا جو ازل سے بنتِ حوا کا مقدر ہے یا پھر اس سے کچھ زیادہ ہی۔ رشتے ناطوں کے حصار گرتے چلے گئے زندگی بے سائبان ہو گئی۔ مجھے سایہ دینے والے درخت کھوکھلے ہو کر زمین بوس ہو گئے۔

تنہائی میری رفیق دیواریں ہمراز اور سناٹے ہمنوا بنتے گئے۔ اف یہ بے سائبان زندگی آخر میرا قصور کیا تھا؟۔

تتلیوں کے پروں کے سارے رنگ اڑ چکے تھے جگنو نے اپنی چمک کھو دی پھولوں سے رنگ اور خوشبوئیں اڑ چکیں۔ ٹپکتی ہوئی چھت اور بوسیدہ دیواروں کے بیچ میرا جسم آہستہ آہستہ ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ میں تو شاید زندہ دفنائی ہوئی ایک سرد لاش ہوں سرد بے حس وحرکت۔

شفق کی سرخی رات کی سیاہی میں مدغم ہونے لگی اداس رات دبے پاؤں آگے بڑھ کر کائنات کو کالی چادر اڑھانے لگی۔ کہیں کوئی آہٹ کوئی سرگوشی نہیں۔ یوں تو زندگی کے دروازے پر عمر کی خزاں رسیدہ دستکیں عرصے سے سن رہی ہوں۔ اس دستک کے جواب میں لبیک کہنے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔

کئی روز سے کسی نئے موضوع کو تلاش ہے پر مل کر ہی نہیں دے رہا ہے۔ کون سے واقعہ کو قلم بند کروں؟ کون ہوگا میری کہانی کا محور عشق و عاشق کی فرسودہ روایتی داستانیں، سماج میں بڑھتے ہوئے جرائم ہر موضوع قلم کی گرفت میں آچکا ہے اب کوئی نیا اچھوتا موضوع کہاں سے لاؤں۔ میں اپنے کمزور ہاتھ میں قلم تھامے نئے موضوع کی تلاش کے گرداب میں بری طرح گرفتار تھی اور تھک کر قلم رکھنا ہی چاہتی تھی کہ ایک مانوس آہٹ سنائی دی۔ میرے اس ویراں خلوت کدے میں اس کی آمد میری بے سکونی پر ایک تازیانہ تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اس کے شاداب چہرے پر کتنی رونق اور تازگی تھی کانوں میں پہنے آویز سے جنکی چمک اس کے صبح رخساروں پر پڑ رہی تھی پشت پر گھنے بالوں کا آبشار کھنکتے ہوئے قہقہے وہ فکر وغم سے اس طرح آزاد معلوم ہوتی تھی جس طرح میں سکون سے، اسے دیکھ کر میری تڑپ حد سے سوا ہوگئی میں نے آنکھیں بند کرلیں میں اسے دیکھنا نہیں چاہتی میں اس سے ہر ناطہ توڑ چکی ہوں۔

''کیوں آئی ہو میری تنہائی میں مخل ہونے کا حق تمھیں کس نے دیا ہے؟ وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی دور کہیں نقرئی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

''ناراض کیوں ہوتی ہو تمھیں کسی نئے موضوع کی تلاش ہے میں تمھیں ایک حقیقی موضوع دینے آئی ہوں''۔ ''کون سا موضوع''

''آج تک تم فرضی کہانیاں جھوٹے قصے لکھ لکھ کر لوگوں کی تفریح فراہم کرتی رہیں۔ پڑھنے والے واہ واہ کرتے رہے تمھارے ہیرو ہیروئن سب خیالی ہیں محض ذہنی اپج تمھارے قلم میں جان ہے کاش تم سچ لکھتیں''۔ ''کون سا سچ''؟

''یہ تم مجھ سے کہہ رہی ہو کیا تم نہیں جانتیں آخر تم مجھے کیوں نہیں لکھتیں مجھے لکھ کر محفوظ کرلو مجھے لکھ کر تم امر ہو جاؤ گی مدتوں بھلائی نہیں جاؤ گی''۔

''نہیں نہیں میں سب کچھ بھول چکی تمھیں بھی بھول گئی۔ سب کچھ ایک ایک لمحہ، یاد ہے تو صرف حال''۔

''حال بے دلی سے مسکرائی'' تمھارا حال ایک زندہ لاش کے سوا کچھ نہیں تم خود فریبی میں مبتلا ہو۔ سکون کی خاطر اس تنہا اجاڑ، بوسیدہ حویلی کی مالکن، اسکی بوسیدہ دیواروں سے لپٹی عشق پیچاں کی بیل کی طرح ماضی کی کھڑکیاں کھولو روشن دانوں کو وا کرو تازگی کو اندر آنے دو''

''ماضی ایک زخمی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر رینگ آئی۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں چاہتی میں نے تمھیں ایک الھڑ دوشیزہ کو موت کی نیند سلا دیا ہے سارے دریچے ایک ایک روزن اپنے ہاتھوں سے بند کر دیا ہے انا کی صلیب پر مصلوب ہوئی لڑکی کو دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے''

''جھوٹ مت بولو۔ جھوٹی کہانیاں لکھتے لکھتے تم خود سے بھی جھوٹ بولنے لگیں، تم کچھ بھی نہیں بھولیں گزرا ہوا ایک ایک لمحہ تمھاری یادداشت کی ڈائری میں محفوظ ہے''

مجھے لگا وہ سچ کہہ رہی ہے سارے جذبے یہاں تک کہ ''اس'' کے ملبوس کی مہک میری روح میں تحلیل ہو چکی ہے وہ لمحات بھی جب آسمان کی رفتوں میں پرواز کرنے والے انا پرست اور جابر جاگیردار جن کی نظروں میں مڈل کلاس طبقے کے لوگ کیڑوں مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے اچانک نیچے آ گئے بساط الٹ گئی کاغذ کی ناؤ ڈوب گئی۔ جاگیردارانہ نظام ختم ہو گیا۔ ایک نئے نظام کی بنیاد پڑی مڈل کلاس طبقہ اپنی ہمت اور تعلیم کی بنا پر آگے بڑھا۔ جہاں پرانی حویلیاں اپنی شکستگی پر بے آواز رو پڑیں وہیں حویلیوں کے حقیر کارندے آگے بڑھے ان کی اولادوں نے عالیشان کوٹھیاں کئی کئی منزلہ فلیٹ تعمیر کرائے ایک نئے معاشرہ کو وجود میں لا گیا۔ سوچ نے یہیں تک سفر کیا تھا کہ اس کی آواز آئی ''ہاں، ہاں لکھو یہی سب لکھو''۔

''نہیں ہرگز نہیں ایک تخلیق کار وہ بھی ایک عورت اپنی ہی ماضی کو قلم سے کاغذ پر منتقل کر دے ایسی عورت کا شمار تو غالباً عجائبات میں ہو سکتا ہے اس کی عمر کا ہر مرد خود کو اس کا مخاطب سمجھے گا۔ وہ رسوا ہونا نہیں چاہتی۔ زندگی کا کلائمکس تو اسی دن ہو گیا تھا جس روز ایک زبردست دھماکہ ہوا تھا۔ جاگیردار کی انانیت اونچ نیچ کا فرق جیت گیا تھا محبت ہار گئی تھی کچھ بھی باقی نہیں بچا لیکن یہ سب لکھنے کے لیے نہیں ہے۔

''تو تم اپنی رسوائی سے ڈرتی ہو''۔ ''ہاں''

''تم نے کوئی گناہ نہیں کیا پھر ڈر کے کیا معنی''

''آخر تم کیا چاہتی ہو لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھائیں''۔

''نہیں میں ایسا نہیں چاہتی تم اپنی کہو''۔

''میں کچھ نہیں چاہتی لیکن خدارا تم یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی جاؤ''

''جب تک تم مجھے اپنے قلم میں قید نہیں کروگی میں ہرگز نہیں جاؤں گی لکھو لکھو مجھے زندہ کر دو''۔ میں نے کاغذ سامنے کیا اور قلم پر گرفت مضبوط کی لیکن یہ کیا الفاظ رنگین تھے میں تو ہمیشہ کالی سیاہی سے لکھتی ہوں پھر یہ سرخ الفاظ۔ قلم پکڑنے سے میرے ہاتھوں پر بھی خون کے دھبے تھے۔

دردودرماں

کمرے میں مکمل سکوت تھا وہ صوفے میں دھنسی کسی انگلش میگزین کے مطالعہ میں غرق اسی سکوت کا حصہ معلوم ہوتی تھیں کہ اچانک فون کی بیل بج اٹھی۔ ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا اکتائے لہجہ میں ہلا کہا۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز نے اکتاہٹ پل بھر میں دور کر دی چہرے پر گلال سا چھا گیا۔ بات چیت ختم کر کے خدا حافظ کے الوداعی کلمات کے ساتھ انہوں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ کسی لڑکی کی طرح تیز قدموں سے باہر آتے ہوئے اناّبی کو پکارا۔

کیا بات ہے بیٹی سب خیر تو ہے انا بی اپنا بھاری بھرکم وجود لیے کچن کے دروازے سے طلوع ہوئیں۔ انا بی سب خیر ہے بھیا بھابی اور بچے آرہے ہیں ابھی بھابی کا فون آیا تھا انہوں نے انا بی کو شانوں سے تھام کر مسرت آمیز لہجہ میں کہا۔ خدا مبارک کرے بیٹی اللہ خیر صلا سے لائے کب تک آئیں گی اس ماہ کے آخر میں کہا ہے۔ اے بیٹی بھلا آج کون سی تاریخ ہے حسب عادت انا بی نے معلومات چاہی آج دس تاریخ ہے۔

انا بی وہیں تخت پر بیٹھ گئیں پاندان اپنی طرف سرکایا۔ ہائے کیسی جگمگاتی حویلی تھی خدا بڑے سرکار اور بیگم کو بخشے کیا رونقیں تھیں۔ آئے دن تقریبیں، مہمان دعوتیں پھول سے دونوں بچے بھاگتے دوڑتے پھر امان میاں کی دلھن کیا آئیں ساس سسر پھولے نہیں سماتے تھے۔ ہائے کیا سماں تھا۔ آج کیسی ویرانی ہے خوشی کی خبر کو بھی کان ترس جاتے ہیں انا بی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

انا بی چھوڑیے پرانی باتیں بھیا بھابی کی پانچ سال بعد آنے کی خوشخبری ملی ہے۔ اس بار شہریار اور فرحین بھی آرہے ہیں ساتھ شہریار کی دلھن بھی عذرا بیگم نے انا بی کی ماضی کی کھوج پر فل اسٹاپ لگاتے ہوئے کہا۔ ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ ان بیس پچیس سالوں میں وہ ہر پل ماضی کی رہگزاروں میں آبلہ پا تھیں۔ انا بی نے انجانے میں انہیں پھر وہیں لے جا کر کھڑا کر دیا جہاں نور و ظلمت کی ملی جلی فضا تھی۔ ہلو پھوپو جانی کیا ہو رہا ہے؟ اس سے پہلے کے وہ بیتی ساعتوں میں ڈوب جائیں ہمایوں کی آواز انہیں حال میں واپس لے آئی۔ آ گئے بیٹا ایک خوشخبری سنو۔ عذرا بیگم نے

جلدی سے کہا۔خوش خبری اور ہمارے گھر میں بس جلدی سے سناڈالیے کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے ہمایوں نے شوخی سے کہا۔

کیوں ایسا کہتے ہو پانچ سال پہلے بھیا بھابی آئے تھے کم خوشی کی بات تھی۔عذرا بیگم نے تیوری چڑھائی۔اوہو سمجھ گیا اب پھر ممی پاپا نے آنے کی اطلاع دی ہوگی۔پانچ سال پورے پانچ سال بعد پھوپو جانی سال میں تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں ہمایوں نے ہنستے ہوئے عذرا بیگم کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔

ہاں بیٹا اس ماہ کی تیس تاریخ کو آرہے ہیں ساتھ میں فرحین،شہری اور اس کی دلھن بھی ہے۔عذرا بیگم اپنی ہی رو میں تفصیل بتانے لگیں انہوں نے شاید ہمایوں کو سنا ہی نہیں۔

اوہو جبھی میری پھوپو جانی کے چہرے پر گلال چھڑکا نظر آرہا ہے۔چل شیطان وہ مسکرائیں۔"اچھا میں فریش ہو جاؤں لیکن کیا آج اس خوشخبری سے پیٹ بھرا جائے گا۔کیوں انابی" ہمایوں نے آخری جملہ انابی کو دیکھتے ہوئے کہا۔نہیں بیٹا جلدی سے آؤ میں نے آج تمھاری پسند کا کھانا پکوایا ہے۔انابی نے پان چباتے ہوئے لہک کر کہا۔

بھابی نے فون پر تاکید کی تھی ہمایوں کو ان کے آنے کے مقصد سے ضرور آگاہ کر دینا۔ دوسرے عذرا بیگم کی بھی یہ دلی خواہش تھی کہ ہمایوں کی شادی جلد ہو جائے تاکہ اس حویلی میں کچھ تو رونق کا سامان ہو۔یہی سب سوچ کر انہوں نے ہمایوں کو اپنے کمرے میں بلایا۔عزیز از جان پھوپی کا پیغام ملتے ہی وہ سعادت مندی سے کمرے میں داخل ہوئے۔فرمایئے پھوپو جانی کیا حکم ہے ہمایوں نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے استفسار کیا۔بیٹا بھیا اور بھابی اس مرتبہ تمھاری شادی کی غرض سے آرہے ہیں اور یہ میری بھی دل خواہش ہے عذرا بیگم گویا ہوئیں۔امی پاپا کو یکا یک میری شادی کا خیال کیسے آگیا ہمایوں نے چھت پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

یہ یکا یک کی بھی ایک ہی رہی۔ماشاءاللہ شادی کی عمر ہے تعلیم بھی خدا کے فضل سے مکمل ہو چکی عذرا بیگم نے ہمایوں کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔اور پھر تمھاری خالہ بھی آئے دن کی بیمار رہتی ہیں وہ چاہتی ہیں جلد سے جلد اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں وہ مزید گویا ہوئیں۔

کون سا فرض میری شادی سے خالہ کی صحت کا کیا تعلق ہمایوں یکلخت سیدھے ہو کر بیٹھ

گئے ۔اے لوتعلق انہیں سے تو ہے آخر نائلہ ان کی اکلوتی بچی ہے۔کیا؟ پھوپو جانی پہلیاں مت بجھائیے صاف بتائیے کیا امی نے نائلہ سے میری شادی کا فیصلہ کیا ہے ہمایوں کے چہرے پر نا گواری تھی۔

بیٹا یہ آج کا فیصلہ نہیں ہے یہ رشتہ تو تم دونوں کے بچپن سے طے ہے۔ وہ بچی شروع سے تم سے منسوب ہے عذرا بیگم نے اطلاعاً کہا۔

کیا کہنے ایسی منسوبیت کے بچے پالنے میں انگوٹھا چوس رہے ہیں۔ والدین قسمتوں کے فیصلے فرما رہے ہیں بغیر یہ سوچے کہ آخر وہ بھی بڑے ہو کر اپنی پسند ناپسند کا حق رکھیں گی۔ میں ایسے کسی فیصلے کو نہیں مانتا۔اور پھر امی پاپا نے تو شروع سے مجھے آپکے حوالے کر دیا تھا۔میری پرورش و پرداخت آپ کے ہاتھوں ہوئی پھر میری زندگی کا یہ سب سے بڑا فیصلہ کرنے کا حق انہیں کس نے دیا۔ ہمایوں نے تند لہجہ میں کہا۔ بیٹا یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔آخر وہ تمھارے ماں باپ ہیں۔رہا میرا سوال یہ بھیا بھابی کا پیار تھا کہ انہوں نے اپنے جگر کا ٹکڑا مجھ بدنصیب کی گود میں ڈال کر میری سونی زندگی کو نئے معنی دیے نائلہ سے رشتہ جوڑنے میں بھی انہوں نے میری رائے کو اہمیت دی اس میں کمی کیا ہے حسن صورت و سیرت دونوں میں لاجواب والدین کی اکلوتی بچی مجھے تو وہ دل سے پسند ہے عذرا بیگم نے تفصیل میں جاتے ہوئے کہا۔

پھوپو جانی آپ کچھ بھی کہیں میں برسوں پہلے کیے فیصلے پر مصلوب نہیں ہو سکتا۔ ہمایوں کے لہجہ میں قطبیت تھی ہمایوں کیا تم کسی اور کو پسند کرتے ہو مجھے بتاؤ کون ہے کیسی ہے؟

بتانے سے فائدہ ہمارے خاندان میں وہی ہوتا ہے جو بزرگ چاہتے ہیں۔ خاندانی آن بان جھوٹی انا اور روایت پرستی پر ہنستی کھیلتی زندگیاں قربان کر دی جاتی ہیں۔لیکن میں ایسا نہیں ہونے دونگا کیوں پھوپو جانی میں نے کچھ غلط کہا ہمایوں نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جھک کر کہا۔

عذرا بیگم کے چہرے پر ایک سایہ آکر گزر گیا۔کیوں کہی ہمایوں نے یہ بات؟ کیا جانتا ہے وہ میری بیتی ہوئی زندگی کے بارے میں کہیں بھابی نے تو......

کیا سوچنے لگیں پھوپو جانی ہمایوں نے انہیں شانوں سے تھام کر پوچھا۔" ہمایوں

رات زیادہ ہوگئی ہے جاؤ جا کر سو جاؤ صبح بات کرینگے" عذرا بیگم کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔اس کے جاتے ہی انہوں نے تکیہ پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں آنسو ایک تواتر سے پلکوں کی باڑھ توڑ کر تکیہ میں جذب ہونے لگے۔دھند میں لپٹا ماضی ورق ورق سامنے تھا۔

زماں خاں نسلاً افغانی پٹھان تھے۔گھر میں خدا کا دیا سب کچھ تھا زمین، جائداد باغ شاندار حویلی اُن کے دو ہی بچے تھے امان اور اس سے پانچ سال چھوٹی عذرا زماں دست قدرت کا بہترین شاہکار گورے مکھڑے پر کالی کالی روشن آنکھیں گھونگر والے بال ماں باپ کی لاڈلی بھائی کی چہیتی۔خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے بچپن کب گزرا پتہ ہی نہ چلا قدموں کے نیچے شباب کی دہلیز آگئی۔خاندان میں لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔عذرا کو بھی ہائی اسکول کے بعد گھر بیٹھا لیا گیا۔امان زماں نے البتہ انجینیر نگ کی ڈگری لی۔ ہمایوں امان زماں کے جگری دوست تھے۔بے تکلفانہ آنا جانا تھا۔زماں خاں اور ان کی بیگم بھی ہمایوں سے بیٹے جیسی محبت کرتے تھے۔پتہ نہیں کب اور کیسے عذرا کی آنکھوں نے ہمایوں کے خواب دیکھنا شروع کر دیے۔ ویسے تو ہمایوں کے خواب نہ جانے کتنی لڑکیاں دیکھتی تھیں۔اونچا پورا قد، سرخ وسفید رنگت پر براؤن آنکھیں پر وقار چہرہ نپا تلا انداز خالق کائنات کا بہترین شاہکار۔

کالج میں لڑکیاں چکوری کی طرح اس کے آس پاس چکراتیں۔لیکن وہ کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ہمیشہ صفِ مخالف کی عزت کرنے والا لیے دیے رہنے والا نوجوان تھا۔

طوبیٰ اس کی چچازاد ہی نہیں بہترین دوست اور ہونے والی بھابی بھی تھی وہ طوبیٰ کو ایک ایک بات بتاتی ہمایوں کو آئے کب گئے انہوں نے آج کس کلر کی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔کیا کیا باتیں کیں۔طوبیٰ کو اس کی طوفانی محبت سے خوف آنے لگتا اگر خدانخواستہ اس کو ہمایوں نہ ملے تو عذرا شاید جی نہ پائے گی۔وہ خلوص دل سے دونوں کے ملن کی دُعا کرتی عذرا تمھیں یقین ہے ہمایوں بھی تمھیں اس طرح چاہتے ہیں ایک روز طوبیٰ نے پوچھا۔یقین تو بہت چھوٹا لفظ ہے میں نے ان کی آنکھوں میں اپنے لیے جذبوں کی قندیلیں روشن دیکھی ہیں۔عذرا کے لہجہ میں یقین بول رہا تھا۔کبھی تم لوگوں نے ایک دوسرے سے اظہار بھی کیا ہے۔طوبیٰ پتہ نہیں کیا معلوم کرنا چاہتی تھی۔

میری اچھی دوست اگر ایسا ہوتا تو میں سب سے پہلے تمھیں بتاتی۔ہم نے کبھی اس موضوع

پر نہ بات کی نہ ضرورت محسوس کی۔ مجھے پتہ ہے ہمایوں کا وقار کبھی محبت کے سطحی ڈائلاگ گوارہ نہیں کریگا۔ دلوں کے رشتے تو آنکھوں سے عیاں ہوتے ہیں زبان سے کہنا سنا توہین محبت ہے۔

محبت خوشبو ہے جو اپنے ہونے کا احساس خود دلاتی ہے میں صرف اتنا جانتی ہوں وہ مجھے ہی اپنی زندگی میں شامل کرینگے عذرا کے لہجہ میں پختگی تھی۔

پھر امان زماں کے شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ ہمایوں نے دل کھول کر دوست کی دوستی کا حق ادا کیا ہر کام میں آگے رہے ہر رسم میں شامل اور عذرا اس کے قدم زمین پر پڑتے ہی نہ تھے وہ ہواؤں میں اُڑ رہی تھی جس کی دید کی انتظار میں وہ کئی کئی روز بے چینی سے گزارتی تھی وہ اس تقریب کے واسطے سے ہر دم نظروں کے حصار میں تھا ہر طرف خوشیاں رقص کرتیں۔ بام و در جھومتے نظر آتے اس تقریب میں ہمایوں کی والدہ بھی آئیں اور اکلوتے نور نظر کے لیے عذرا کو پسند کر لیا۔

شادی کے ہنگامہ سرد پڑ گئے طوبیٰ نے بھابی کا روپ دھار لیا۔ دونوں کی چاہت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ طوبیٰ کے پاس بھاگ بھاگ کر جانے کی مشقت سے بھی چھٹکارہ مل گیا ایک سہانی شام ہمایوں کی والدہ رشتہ لیکر آئیں عذرا جھوم اٹھی ہمایوں ہمیشہ کے لیے اس کا ہو جائے گا پاپا اور امی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ خوبصورت، قابل، لائق و فائق با وقار دولتمند ایسا داماد تو قسمت والوں کو ملتا ہے۔ طوبیٰ کچن میں چائے بنا رہی تھی وہ سر پر سوار تھی۔

بھابی چائے بہت عمدہ ہونی چاہیے لہک کر کہا۔ خود کیوں نہیں بناتیں میں وہ جذبے کہاں سے لاؤں جن کو ڈبو کر چائے مزیدار ہو جائے۔

طوبیٰ چائے لے کر ڈرائنگ روم میں گئیں اور اس نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ آج کا دن مبارک ہے۔ امی پاپا اس کی پسند پر اپنی منظوری کی مہر ثبت کر دینگے اسے لگا کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی خوشبوں سے ہم آہنگ ہو۔ اتنی خوشی سے کہیں اس کا دل نہ رک جائے اچانک لاؤنج سے آنے والی آوازوں نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔

امان تمھاری بات سو فی صدی صحیح ہے۔ مانتا ہوں ہمایوں جیسے لڑکے قسمت والوں کو ملتے ہیں لیکن یہ بھی تو دیکھو ہم پٹھان وہ شیخ یہ رشتہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں نے صاف صاف

منع کر دیا۔ اماں خدا معلوم کون کون سی دلیلیں دیتے رہے۔ لیکن اس سے آگے وہ کچھ نہ سُن پائی رنگ فق آنکھیں کرب کی شدت سے پھیل گئیں۔ سارا وجود زلزلوں کی زد میں تھا بات چیت اسی ٹاپک پر ہو رہی تھی لیکن اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اپنی قسمت کا فیصلہ جان چکی تھی۔ اچانک بڑے زور کا چکر آیا وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئیں۔

ہوش آنے پر طوبیٰ بھابی کو اپنے قریب پایا وہ انکے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ نہ رو میری جان تمھیں بہت تیز بخار ہے۔ پھر کتنے ہی دن گزرے ڈاکٹر تندہی سے علاج کر رہے تھے لیکن بخار ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ ایسے میں ایک روز اسے ہمایوں کی آواز سنائی دی وہ بھابی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ عذرا نے جلتی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ لٹا لٹا سا تھا جسے اپنا سارا سرمایہ لٹا کر دیوالیہ ہو گیا ہو۔ اسنے دکھ سے عذرا کی طرف دیکھا۔ عذرا کے حلق سے بے آواز چیخیں نکلنے لگیں اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ بھابی دانستہ دونوں کو بات چیت کا موقع دینے کے لیے چائے کے بہانے کمرے سے باہر چلی گئیں۔ عذرا بدقت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آپ آپ یہاں کیسے آئے امی پاپا کو پتہ چلا تو۔ گھبراؤ مت وہ دونوں فارم گئے ہوئے ہیں میں تم سے چند باتیں کرنے آیا ہوں ہمایوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

عذرا میں نے تمھیں شرعاً و قانوناً اپنانا چاہا تھا یہ کوئی گناہ نہیں ہے اور نہ محبت گناہ ہے یہ تو الوہی جذبہ ہے جو دو روحوں کی گہرائی میں اتر کر ان کو ایک کر دیتا ہے۔ لڑکی کو بھی اپنے شریک زندگی کو منتخب کرنے کا حق ہمارے مذہب نے دیا ہے تم اپنے اس حق کا استعمال کرو۔

نہیں نہیں میں اپنے والدین سے ٹکر نہیں لے سکتی عذرا دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر چیخ اٹھی۔ پھر کیا مجھے بھول جاؤ گی براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

مشرقی لڑکی ایک ایسا پرندہ ہوتی ہے جو صرف صیاد کی مرضی کا پابند ہوتا ہے۔ یہاں پگڑی کی مان پر کتنی زندگیاں قربان ہو جاتی ہیں اور پھر ہر خواب شرمندہ تعبیر کب ہوتا ہے آپ خدارا مجھے بھول جایئے اور کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لیجئے الفاظ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔

کاش یہ سب اتنا آسان ہوتا اور پھر تم، تم کیا کرو گی ہمایوں کے لہجہ میں ہزاروں حسرتیں بول رہی تھیں۔ میں کیا کرونگی ایک مشرقی لڑکی روایات کی دیواروں میں زندہ چن جانے

پر اُف نہ کرنے والی۔

پھر وہ تھکے تھکے قدموں سے واپس لوٹ گیا کبھی نہ آنے کبھی نہ ملنے کے لیے صرف خوابوں کی حد تک محدود رہنے کے لیے۔ اس نے وقت رخصت کسی وعدے کی زنجیر میں قید نہیں کیا تھا وہ آزاد تھی۔ وہ یادوں کی صحرا میں آبلہ پائی کے لیے تنہا رہ گئی۔ چاہنے والے بھائی نے والدین کو قائل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ ادھر ایک ہی جواب تھا زبان ایک ہوتی ہے۔ پھر کتنے ہی رشتے آئے لیکن اس کی ناں ہاں میں نہیں بدلی ماں باپ اس کی شادی کا ارمان لے کر موت کی بے رحم وادی میں اتر گئے۔ طوبیٰ اپنی تسلی دلاسوں سے اس کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتیں۔ لیکن سب بے سود اس نے خاموشی کے خول میں اپنے کو بند کر لیا تھا۔ زندگی بغیر کسی مقصد کے یوں ہی بیتی جا رہی تھی وہ زندگی جس میں کوئی مقصد کوئی ٹارگٹ نہ ہو بوجھ بن جاتی ہے بس صبح شام میں تبدیل ہوئی اور شام رات میں ڈھل گئی کہ اچانک اس خاموشی میں ایک خوشگوار ہلچل پیدا ہوئی۔ امان زماں دو جڑواں بیٹوں کے باپ بن گئے۔

بھابی میری ایک التجا ہے خاموشی کا خول چٹخا۔ کہو کہو کیا بات ہے بھیا بھابی نے یک زبان ہو کر کہا۔ ایک بچہ مجھے دے دیں لہجہ ملتجی تھا۔ کیسی باتیں کرتی ہو عذرا یہ دونوں تمھارے ہی ہیں طوبیٰ نے مسکرا کر کہا۔ نہیں بھابی آپ ان میں سے ایک کو اپنے ہاتھوں میری گود میں ڈال دیں میری بے مقصد زندگی کو معنی مل جائنگے عذرا کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ اماں نے پالنے سے اٹھا کر ایک بچہ عذرا کی گود میں دے دیا میں اس کا نام ہمایوں رکھونگی اس کے گلابی گال پر پیار کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر عذرا نے کہا۔

دونوں میاں بیوی نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو ہمایوں کی ذات میں گم کر لیا۔ اس نے ایک ایسا کھلونا پا لیا تھا جس سے کھیل کر اس کے زخموں کی ٹیس ایک حد تک کم ہو گئی تھی۔

وقت کا پنچھی پر لگا کر اڑتا رہا۔ وقت اپنے ساتھ بہت سی تبدیلیاں لایا امان کو امریکہ میں جاب مل گئی وہ بیوی بچوں کے ساتھ عذرا کو بھی لے جانا چاہتے تھے مگر ان کی تمام دلیلیں طوبیٰ کی التجائیں ناکام ہو گئیں عذرا نے یہاں سے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ مرتے دم تک اس حویلی کو

چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں انہیں دیواروں میں ہمایوں کے جاتے ہوئے قدموں کی دھمک تھی یہیں اس نے ہمایوں کے ساتھ جینے مرنے کے سہانے خواب دیکھے تھے اور وہ خواب اسی زمین پر ٹوٹ کر تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئے اس کے در و دیوار پر اس کی ناکام محبت کی کتنی کہانیاں رقم تھیں۔

محبت محدود ہوتی ہے عشق لامحدود اور وہ تو کچھ اور آگے بڑھ گئی تھی۔ اس منزل میں تو سود و زیاں بے معنی الفاظ ہو جاتے ہیں یہی عشق اگر خدا سے ہو تو سلوک کی کتنی منزلیں طے ہو جاتی ہیں۔ حویلی اس کی یادوں کا معبد تھا وہ کس طرح اسے چھوڑتی۔ مجبوراً امان زماں اور طوبیٰ اس کی ضد کے آگے ہتیار ڈال کر ہزاروں میل دور چلے گئے وہ لناہی اور دو وفادار ملازموں کے ساتھ ننھے ہمایوں کو سینے سے لگائے حویلی کی دیواروں کے درمیان رہ گئی۔ دل کی دہلیز پر آس کا ایک ننھا دیا روشن تھا یہ خدا کی بنائی ہوئی زمین بے انتہا وسیع ہے۔ بچھڑنے والا زندگی کے کسی موڑ پر اچانک سامنے آ جائے اور اسکی عبادت کو زندگی مل جائے۔

اللہ ہو اکبر کی آواز ملگجے اندھیرے میں گونجی اور وہ خیالوں کے پاتال سے واپس لوٹ آئیں جلدی سے اٹھیں وضو کیا اور جائے نماز پر آ گئیں لمحہ کے ہزارویں حصہ میں انہوں نے ایک فیصلہ کر لیا۔

ناشتہ کی میز پر انہوں نے جان بوجھ کر ہمایوں سے وہی ذکر چھیڑ دیا۔ ہمایوں اپنی پسند اپنی پھوپو جانی کو نہیں بتاؤ گے۔ کیا فائدہ جواب آیا۔ فائدہ نقصان کا چکر چھوڑو۔ تمھاری زندگی میں وہی آئے گی جو تمھاری پسند ہو ان کے لہجہ میں اعتماد بول رہا تھا۔ اور امی پاپا؟ ہمایوں کا انداز سوالیہ تھا۔

اس کی فکر نہ کرو امی پاپا مجھ سے الگ نہیں ہیں میں بھیا بھابی کے آنے سے پہلے تمھارا رشتہ اپنے ہاتھوں طے کروں گی۔ پھوپو دی گریٹ ہمایوں نے ان کے دونوں ہاتھ آنکھوں سے لگا لیے۔ شام کو تیار رہیے گا میں آپ کو اس کے گھر تک ڈراپ کر دونگا ہمایوں کے انگ انگ سے خوشی چھوٹ نکلی وہ تو رہونگی ہی لیکن کچھ تو بتاؤ کون ہے؟ کہاں رہتی ہے۔

پیاری پھوپو جانی اتنے سوال اس نے میرے ساتھ ہی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کیا ہے۔ والدین کی اکلوتی اولاد ہے بیچاری کی ماں بچپن میں ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔ صرف والد ہیں۔ ہمایوں نے تفصیل میں جاتے ہوئے کہا اسی شام وہ اپنے ہمایوں کی پسند کو اپنانے جا رہی تھیں۔

ہمایوں بڑی ترنگ میں گاڑی چلا رہا تھا۔ عذرا بیگم کے ذہن کے اسکرین پر وہ شام ابھری جب اسی طرح ہمایوں کی والدہ اس کا رشتہ مانگنے آئی تھیں۔ اور پھر اس شام کے بعد ان کی زندگی میں کوئی جگمگاتی ہوئی صبح طلوع نہیں ہوئی۔ وہ یادگار شام شام غم تھی جس کی کوئی سحر نہیں تھی۔

گاڑی ایک دھچکے سے رک گئی وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ سامنے ایک شاندار کوٹھی کا گیٹ تھا۔ کیا گھر آ گیا عذرا بیگم نے سوال کیا۔ ہمایوں نے اتر کران کی طرف کا گیٹ وا کیا اتر آیئے پھوپو جانی کیوں کیا تم ساتھ نہیں چل رہے۔ میں تو اکثر ہی آتا رہتا ہوں آج تو آپ کو تنہا ہی جانا ہوگا۔ دو گھنٹے بعد آپ کو لینے آ جاؤنگا۔

خدا کرے تم بامراد ہو میری بدنصیبی کا سایہ تم پر نہ پڑے انہوں نے دل ہی دل میں دُعا کی اور کھلے گیٹ سے اندر داخل ہو گئیں۔ سامنے سے آتے ملازم نے ایک مستفسرانہ نظر ان پر ڈالی۔ بی بی کہاں ہیں انہوں نے ملازم سے دریافت کیا۔

جی وہ تو گھر پر نہیں ہیں ان کے والد ہیں آپ بیٹھیے ملازم نے شاندار ڈرائنگ روم میں ان کو لا کر صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مودب لہجہ میں کہا۔

پانچ منٹ بعد ڈرائنگ روم کا پردہ ہٹا اور جو شخصیت سامنے آئی وہ عذرا کے ہوش اُڑا دینے کو کافی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں مانو زمین کی گردش رُک گئی ہو۔ دل کی دھڑکن کانوں میں سنائی دینے لگی۔ ہمایوں تم کپکپاتی آواز میں سوال ہوا۔

ہمایوں کی حالت بھی ان سے مختلف نہیں تھی وہ ایک ایسا سنگی مجسمہ لگ رہے تھے جس کو کسی جادوگر نے اپنے عمل سے پتھر میں ڈھال دیا ہو۔

اچانک مجسمہ نے حرکت کی وہ آگے بڑھے۔ عذرا تم میرے گھر میں کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ یہی میں سوچ رہی ہوں ان کے آنکھوں سے چشمے پھوٹ نکلے۔ مت رو بیٹھ جاؤ ہمایوں نے بیٹھتے ہوئے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ دیا۔ بتاؤ عذرا تمھیں میرا پتہ کس نے دیا تمھارا یہاں کس سلسلے میں آنا ہوا۔ آپ کا پتہ........ وہ سلسلہ وہ ہکلا کر رہ گئیں۔

ہمایوں نے بٹن پش کیا ملازم کی آمد پر کوئی ٹھنڈا مشروب لانے کو کہا۔ اس عرصے میں دونوں کے درمیان ایک بے نام خاموشی تھی۔ ملازم جلد ہی ٹھنڈا لے آیا۔ ہمایوں نے ایک گلاس

عذرا کو دیا اور دوسرا خود اٹھالیا۔ ہاں اب بتاؤ تمھیں میری آمد کا پتہ کیسے چلا۔

آمد کا پتہ کیا آپ کہیں باہر تھے۔ ہاں میں نے دوبئی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ دو سال پہلے ہی یہاں آیا ہوں۔

مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ یہ آپ کا گھر ہے میں تو بس ایک ضروری کام سے آئی تھی۔ عذرا نے گمبھیر لہجہ میں کہا۔ کیا ضروری کام وہ حیران ہوئے۔ آپ ہمایوں کو جانتے ہیں جو آپکی بیٹی کے ساتھ پڑھتا ہے۔ اور بہت اچھی طرح وہ بہت پیارا بچہ ہے۔ یکلخت ان کے چہرہ پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا۔ جسے بات کی تہہ تک پہنچ گئے ہوں۔ عذرا ہمایوں تمھارا بیٹا ہے۔ تمھاری شادی کہاں ہوئی ہے۔ میری شادی۔ ہمایوں عورت زندگی میں صرف ایک ہی بار پیار کرتی ہے۔ میں نے شادی نہیں کی میں منافقت کی زندگی نہیں جی سکتی تھی۔ دل میں کسی کو بسا کر کسی کا گھر بسانا میری دانست میں گناہ عظیم ہے۔ آپ سنایئے کہاں شادی کی۔ ہمایوں کو لگا عذرا کے الفاظ زہر میں ڈوبے تیر ہوں جو ان کی شہ رگ میں پیوست ہو گئے ہوں۔ ایک سرد آہ ان کے ہونٹوں پر دم توڑ گئی۔

تم سے جدا ہونے کے بعد زندگی بے رنگ ہوگئی نہ وسوسہ نہ کوئی امنگ۔ والدہ کے بیحد اصرار پر بھی میں شادی پر آمادہ نہیں ہوا۔ اچانک ایک رات والدہ پر فالج کا اٹیک ہوا انہوں نے اپنی آخری خواہش کا اظہار میری شادی کی صورت میں کیا۔ میں مجبور ہو گیا جاں بلب ماں کا مان نہ توڑ اسکا۔ عفت میری زندگی میں آگئی میں نے پہلے ہی دن اس کو بتا دیا کہ تم صرف میری ماں کی خوشی ہو تمھاری ضروریات میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ لیکن مجھ سے محبت کی توقع کبھی نہیں رکھنا وہ انتہائی صابر وشاکر عورت ثابت ہوئی۔ اس کا میرا ساتھ بہت مختصر رہا۔ بچی کی پیدائش پر وہ مالکِ حقیقی سے جاملی۔ بچی کو اس کی نانی کے سپرد کر کے میں دوبئی چلا گیا۔ ہر سال بچی سے ملنے آتا رہتا اب اس کے مسلسل اصرار پر مستقل آگیا ہوں ہمایوں نے تفصیل میں جاتے ہوئے کہا۔

ہمایوں شاید تم نہیں جانتے تمھاری بیٹی اور ہمایوں ایک دوسرے کی محبت میں پور پور ڈوبے ہوئے ہیں میں آج اس سلسلے میں یہاں آئی ہوں۔

عذرا یاد کرو وہ شام جب میری والدہ بے نیل و مرام تمھارے دروازے سے لوٹ کر آئی تھیں۔ وہ وقت سے پہلے میری نارسائی کا غم لیکر دنیا سے چلی گئیں۔ میرے ساری زندگی دکھوں کی

آماجگاہ بن کر رہ گئی میرا قصور کیا تھا میں ایک شیخ کا بیٹا تھا میں نے ایک پٹھان کی بیٹی کو رفیق حیات بنانا چاہا تھا۔

سید، پٹھان، شیخ، مغل انصاری یہ انسانوں کے عطا کردہ عذاب ہیں ورنہ حضور صلی علیہ وسلم کا قول ہے سب مسلمان ایک ہیں ہم میں وہ سب سے بہتر ہے جس کے اعمال صالحہ ہیں۔ یا پھر یہ ہندو کلچر کی دین ہے۔ ہمایوں کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ میری عذرا ایک شیخ کی بیٹی ہے، ہمایوں نے مزید کہا۔ کیا کیا تمھاری بیٹی کا نام عذرا ہے۔ عذرا بیگم کو اپنا آپ معتبر ہوتا معلوم ہوا۔ عذرا میں نے اس کا نام تمھیں کبھی نہ بھولنے کے لیے ہی عذرا رکھا۔ کیا معلوم تھا برسوں بعد پھر ہمایوں اور عذرا ایک نئی کہانی کے کردار بن کر سامنے آئیں گے۔

ہمایوں خدا کے لیے سب بھول جاؤ سب کچھ میں نہیں چاہتی تاریخ ایک بار پھر اپنے کو دہرائے۔ ہمارے بزرگ ہمارے بیچ دیوار بنے تھے۔ دو زندگیاں برباد ہو گئیں تم شاید نہیں جانتے میرے انا پرست والدین بھی میرا گھر بسنے کی آرزو لیکر دنیا سے چلے گئے۔ آج کے غلط فیصلے سے ایک اور عذرا زندہ لاش بن کر رہ جائے گی۔ ایک اور ہمایوں غم کی زندہ تصویر بن جائے گا۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں پیچھے مڑ کر دیکھو ہم کس طرح ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے۔ میں نے ساری دلچسپیوں سے منھ موڑ کر زندگی تمھاری یاد کے ساتھ بسر کی اور یہی حال کم وبیش تمھارا ہوا صبح اٹھ کر بالکنی میں کھڑی ہو کر آنے والی اس شاہراہ پر نگاہیں جما دیتی جس پر کبھی تمھارے قدم پڑے تھے لیکن کیا ملا۔

سو گئی راہ تکتے تکتے ہر ایک راہ گزر
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ

ہمایوں دونوں ہاتھوں میں سر تھامے خیالات کی نہ جانے کونسی رہگزر پر محو خرام تھے۔ عذرا کے خاموش ہوتے ہی انہوں نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ عذرا کو دیکھا ان کی زندگی کا پہلا و آخری حسین خواب ان کے دل کی بے آواز دھڑکن۔ ہمایوں کون ہے یقیناً تم نے اسے گود لیا ہوگا اندازہ استفہامی تھا۔ ہمایوں امان بھائی کا بیٹا ہے ان کو قدرت نے دو جڑواں بچوں سے نوازا تھا جس میں

سے ایک کو میں نے اپنی سونی زندگی کا مقصد بنالیا۔ ہمایوں امان زماں کا بیٹا ہے اف میرا عزیز ترین دوست۔

عذرا تم نے زندگی میں مجھ سے پہلی بار کچھ مانگا ہے میں تمھیں مایوس نہیں کرونگا۔ لیکن کیا امان اور اس کی بیوی اس رشتہ پر راضی ہو جائینگے۔ ہمایوں شاید تمھیں معلوم نہیں امان بھائی نے کس کس طرح بحث اور دلائل دے کر پاپا کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ان کی ہر دلیل پاپا کی روایت پرستی سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی وہ آپ کو بہت پسند کرتے تھے ہمیشہ انہوں نے آپ کی کمی محسوس کی۔ ایک اچھا دوست کھونے کا صدمہ انہیں ہمیشہ رہا۔ وہ اکثر کہتے اپنے دوست سے بچھڑ کر زندگی میں ایک خالی پن محسوس ہوتا ہے دونوں کی گفتگو کے دوران ایک خوبصورت چینی کی گڑیا جیسی لڑکی ڈرائنگ روم کا پردہ اٹھا کر اندر آئی۔ پاپا آپ یہاں بیٹھے ہیں میں نے آپ کو سب جگہ تلاش کرلیا۔ اس نے شاید سائڈ کے صوفے پر بیٹھی عذرا بیگم کو نہیں دیکھا۔ بیٹا ان سے ملو یہ ہمایوں کی پھوپو ہیں ہمایوں نے عذرا بیگم کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ عذرا نے قریب آ کر سلام کیا۔ شام کا ملگجا اندھیرا رات کی سیاہی میں مدغم ہونے لگا مجھے ہمایوں کا انتظار تھا۔ عذرا مجھے بہت پسند آئی وہ ہلکے پھلکے انداز میں مجھ سے باتیں کرتی رہی ہمایوں بھی گفتگو میں وقتاً فوقتاً حصہ لیتے۔ ہمایوں مجھے لینے آ گیا تھا اسے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر عذرا کے چہرہ پر وہی دھنک رنگ نظر آئی جو کبھی میرے چہرہ پر اترتی تھی میں نے صدق دل سے دونوں کی خوشگوار زندگی کے لیے دُعا کی۔ ہمایوں اور عذرا نے ہم دونوں کو ضد کر کے رات کے کھانے پر روک لیا۔ کھانے کے بعد ہمایوں سے اجازت لیکر کھڑی ہوگئی۔ باہر تک عذرا اور ہمایوں ساتھ آئے ہمایوں نے گاڑی اسٹارٹ کی عذرا نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہمایوں ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہہ رہے تھے۔

بھیا بھابھی مع بچوں کے امریکہ سے آ گئے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ان کے آگے ساری داستان کہہ سنائی۔ ڈر صرف یہ تھا کہ نائلہ طوبیٰ بھابی کی سگی بھانجی ہے اور رشتہ برسوں سے طے ہے۔ بھابی نے فراغ دل کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ لگالیا۔ عذرا تم نے ہمایوں کے لیے بہت اچھا فیصلہ کیا نائلہ بھی کہیں نہ کہیں بیاہی جائے گی لیکن ہمایوں ٹوٹ کر بکھرنے سے بچ گیا۔ مجھے لگا میرے چاروں طرف پھول کھل رہے ہوں بہاریں رقص کر رہی ہوں۔

اگلے دن شام کو میرے ساتھ بھیا بھابی مع بچوں کے ہمایوں کے ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ بھیا بیقراری سے بچھڑے ہوئے دوست سے بغل گیر ہوئے دونوں ہی کی آنکھیں گیلی تھیں عذرا اور ہمایوں حیرت سے دونوں کا ملن دیکھ رہے تھے۔ بھابی نے ہمایوں سے اجازت لیکر پرس سے ہیرے کی انگوٹھی نکالی۔ لو عذرا یہ اپنی بہو کو پہنا دو۔ عذرا نے شرمائی لجائی عذرا کے دودھیا ہاتھ کی انگلی میں انگوٹھی ڈال دی۔ چاروں طرف خوشیاں رقص کرنے لگیں عذرا کو لگا جیسے اس کی عمر بھر کی ریاضت کو زندگی مل گئی ہو۔ اس کی غمناک زندگی کی یہ آخری شام ہو عذرا اور ہمایوں کا ملن اس کے درد کا درماں ہو................

اُجالے کا قرض

ٹرن، ٹرن کال بیل مسلسل بج رہی تھی۔ وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے صوفے میں دھنسی اپنا پسندیدہ ڈائجسٹ پڑھنے میں منہمک تھی۔ ''اے بیٹی کیا کانوں میں تیل ڈال کر بیٹھی ہو جو اس موئی گھنٹی کی آواز کانوں تک نہیں پہنچ رہی ہے''۔ دادی اماں کی کرخت آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''توبہ ہے کسی وقت سکون نہیں ہے آنے والوں نے بھی بس ہمارا ہی گھر دیکھ لیا ہے''۔ شامہ اٹھتے ہوئے بڑبڑائی۔

''توبہ کر لڑکی مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں'' دادی اماں نے نصیحت کی۔ شامہ نے سخت بیزاری سے گیٹ کھولا۔ خالہ رحمت اپنے بھاری بھر کم وجود کے ساتھ گیٹ سے طلوع ہوئیں ''السلام علیکم خالہ'' شامہ نے سلام داغا۔

جیتی رہ بیٹی اور نصیب اچھا کرے کہتی ہوئی خالہ رحمت والان کی سمت مڑیں۔ ''آؤ آؤ رحمت تم تو غائب ہی ہوگئیں اللہ قسم کئی دنوں سے راہ تک رہی تھی، خود ہی آ جاتی کمبخت گھٹنوں کے درد نے لاچار کر دیا'' دادی اماں نہایت لاڈ سے بولیں۔ ''کیا بتاؤں راحلہ بیگم جان کو ہزاروں عذاب لگے ہیں افضل کی بیٹی کی شادی ہے۔ اس کی دلہن سر ہوگئی'' خالہ سب کے جہیز کا سیتی پروتی ہو اس بچی کے سب کپڑے لتے تمہیں ہی سینا ہیں۔ اب جانو پہلے جیسی بات تو رہی نہیں پھر نکڑی کے غرارہ سوٹ میں نظر کا کام ہوتا ہے'' خالہ رحمت نے غیر حاضری کا جواز پیش کیا۔ ''اے دفع کرو کام لینے کو سب آ جاتے ہیں کوئی یہ بھی پوچھتا کس حال میں ہو'' دادی اماں نے مشورے سے نوازا۔

''کیا کروں مجھ سے کسی کے کام کو منع نہیں ہوتا اور پھر پتہ نہیں کِتے (کتنے) دن کی زندگی ہے اپنے ہاتھ سے جس کا جو بھلا ہو جائے اچھا ہے اس گوشت کو تو چیل کوے بھی نہیں کھائیں گے قبر میں پڑا پڑا گل جائے گا'' رحمت خالہ نے اپنا فلسفہ بیان کیا۔

''ارے خالہ اس دور میں چیل کوؤں کی بن آئی ہے۔ فکر نہ کریں کہیں فساد ہوتا ہے

لاشیں بے گور و کفن پڑی ہوتی ہیں چیل کوئے دعوت اڑاتے ہیں'' ندیم نے کمرے سے نکل کر خالہ کے آخری جملے پر ٹکڑا لگایا۔''اے سلام نہ دُعا یہ کیا بکواس کرتا ہوا نکلا'' دادی اماں نے اپنا فرض سمجھایا۔''اے میاں جیو اللہ ہزاری عمر کرے اماں باوا کا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ اللہ دادی کو سہرا دکھائے'' خالہ نے بغیر سلام کے دُعاؤں سے نوازا۔'' آمین، آمین اللہ آپ کو بھی دکھائے آخر آپ بھی تو دادی ہیں۔ندیم نے لاڈ سے کہا۔

''چل ہٹ لڑکے، اللہ دادی کو سلامت رکھے میں کیوں دادی ہونے لگی'' خالہ رحمت جلدی سے بولیں۔''ارے خالہ آپ تو خفا ہو گئیں آخر دادی کی سہیلی بھی تو دادی ہوتی ہے''۔

''ہاں خیر یہ تو ہے'' خالہ رحمت نے کہا۔ راحلہ بیگم خاموش بیٹھی فضاؤں میں خدا جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔''شامہ خالہ کے لئے چائے لے کر آؤ ساتھ میں کچھ کھانے کو بھی لانا'' انہوں نے حکم صادر کیا۔''اے دلہن کہاں ہیں نظر نہیں آئیں کونہ گھوش تو شروع سے ہیں'' رحمت خالہ نے خود ساختہ لغت سے ایک حسین محاورہ اٹھایا۔

''نہیں رحمت اب وہ پہلی والی بات نہیں رہی ماشاء اللہ بچے جوان ہو گئے۔ بیٹی بیاہ دی بس ذرا جیلہ کی خیر خبر لینے گئی ہیں آتی ہی ہوں گی''۔دادی اماں نے بتایا۔

''اللہ اصل خیر سے چاند سے بچے کا منہ دکھائے'' خالہ نے دُعائیہ لہجہ میں کہا۔ وجاہت علی خاں ہائیڈل میں انجینئر تھے دو بیٹوں میں سے ایک کی پانچ سال قبل شادی کر چکے تھے۔شامہ کا بی۔اے کا آخری سال تھا۔ندیم کا میڈیکل کا آخری سال تھا۔گھر میں دادی اماں کا سکہ چلتا تھا۔ بیٹا اور بہو دونوں سعادت مند تھے۔ان کے ہر حکم کو حرف آخر مانتے تھے۔اس طرح یہ کنبہ ان خوشحال اور خوش نصیب گھروں میں سے ایک تھا جہاں کسی کو کسی سے کوئی شکایت تھی نہ گلہ۔نہ ساس بہو کی روایتی جھگڑے تھے نہ روحوں میں زہر گھولنے والی بدمزگی۔

رحمت خالہ کو سب بچے بچپن سے دیکھتے چلے آرہے تھے۔وہ شاید دادی اماں کی بچپن کی کوئی سہیلی تھیں کیونکہ ان کے لیے دادی اماں کا حکم تھا''رحمت کی اسی طرح عزت کیا کرو جیسے میری کرتے ہو۔'' ''واہ ان کا مرتبہ آپ کے برابر کیسے ہو گیا۔'' اکثر شامہ کہہ اٹھتی۔

''چپ بدزبان، جو منہ میں آیا بک دیا'' دادی اماں غصہ سے لال پیلی ہو جاتیں۔

دادی اماں کے غصے سے سبھی ڈرتے تھے لیکن شمامہ دادی کی لاڈلی ہونے کے سبب تھوڑی سی ضدی تھی۔ رحمت خالہ ہمیں صفت موصوف ٹائپ کی تھیں۔ سینے پرونے میں ایسی طاق کے ملنے جلنے والوں میں کوئی لڑکی ایسی نہیں تھی جس کے جوڑوں میں خالہ کی کارگزاری نہ ہو۔ عزیز ترین سہیلی کی پر پوتی کی شادی پر مہینوں پہلے سے کپڑوں کا انبار لے کر بقول شمامہ خالہ خود مانجھے بیٹھ گئی تھیں پھر ان کی سوئی نے وہ کمال دکھایا کہ جس نے دیکھا عش عش کر اُٹھا۔ شادی بیاہ کی تقریب میں ڈھولک وہ لاجواب بجاتیں کہ سننے والے واہ واہ کر اٹھتے۔ سہاگ کے گیت ہوں یا دولہے کے سہرے ایسے لہک کر گاتیں کہ لڑکیاں فلمی گیت بھول جاتیں بجیلہ کی مہندی میں ''بنو کے ہاتھ بھرے مہندی'' اور ''تیری محفل میں ارمانوں کا دولہا بن کے آئے ہوں'' آج بھی یاد آ کر مزہ دیتے۔

اُن کا گھر تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ گھر پورا چڑیا گھر تھا جس میں ڈیڑھ درجن مرغیاں کبوتر دو کتے بھورا اور شیرو۔ کالی اور سفید بلیاں مع اپنی آل اولاد کے ساتھ ایک طرف چوکی پر مور صاحب بھی اپنی کلغی پر اتراتے ہوئے براجمان ہوتے۔ بچپن میں شمامہ جب بھی دادی کے ہمراہ رحمت خالہ کے یہاں جاتی فوراً واپسی کی رٹ لگا دیتی لیکن ندیم کو خالہ کا گھر بڑا اچھا لگتا۔ وہ خالہ کی کسی موٹی تازی مرغی یا مرغے کو تاڑ لیتا اور فوراً خالہ سے کہتا ''ہائے کتنا خوبصورت مرغ ہے لیکن بیچارہ بیماری میں آ گیا کل تک مر جائے گا۔''

''اے ہے بیٹا ذرا غور سے دیکھو تم تو ڈاکٹر ہو کوئی دوا دارو تو ہو گی'' خالہ بولائی ہو آتیں۔ پیار سے اپنے لاڈلے مرغ پر ہاتھ پھراتیں۔

''نہیں خالہ میں نے چیک کر لیا بیماری خطرناک ہے اب اس پر دوا اثر نہیں کرے گی دوسرے یہ اڑ کر لگنے والی جان لیوا بیماری ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اور مرغیاں بھی'' ندیم مایوس سے گردن ہلا کر کہتا ''اے ہے اللہ نہ کرے'' خالہ دہل جاتیں۔

''اچھا خالہ اگر آپ کہیں تو میں اس کو اپنے ساتھ لے جاؤں کم از کم اور مرغیاں تو محفوظ رہیں گی۔'' مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر ندیم گھر آ کر یہ کارنامہ سناتا۔ ''پکّے بے ایمان ہو کیا مرغ کا گوشت نصیب نہیں ہوتا جو بیماری خالہ کو الٹی سیدھی پٹی پڑھا کر لاتے ہو شمامہ کو سخت برا لگتا۔

ہنسی تو جب آتی ہے جب خالہ مجھے بجائے انسانوں کے جانوروں کا مستند ڈاکٹر سمجھتی

ہیں۔ندیم ہنسی سے دوہرا ہوتے ہوئے کہتا۔"لڑکے شرم کرو ایک دو سال میں ڈاکٹر کی سیٹ پر بیٹھ جاؤ گے حرکتیں ایسی اچکی اللہ کی پناہ امی سرزش کرتیں۔

"میں دادی اماں کو ضرور بتاؤں گی، آہ بیچاری خالہ" شمامہ دھمکی دیتی۔"اور خالہ کی سگی اگر دادی اماں کو بھنک بھی مل گئی تو تیری خیر نہیں۔وہ جو سہیلیوں کی فاتحہ میں میری بانک پر لد کر جاتی ہے سب بند"۔"ہائے بھائی! زبان بند کرو کیوں میری سہیلیوں کو کوستے ہو۔" شمامہ روہانسی ہو جاتی۔"اللہ کرے خالہ خود کسی دن دادی اماں سے تمہارا کارنامہ کہہ دیں پھر پتہ لگے گا۔" شمامہ نے کچن کی طرف جاتے جاتے کہا۔لیکن یہ شمامہ کی حسرت رہی خالہ رحمت نے ندیم کے اس کانامے کا کبھی ذکر نہیں کیا۔بجیلہ کے یہاں پانچ سال کے طویل انتظار کے بعد بیٹے کی شکل میں ایک حسین پھول کھلا۔ان پانچ سالوں میں وہ کتنی اداس رہتی کتنی بار بانجھ کا لقب سننے کو ملا۔دراصل صادق بھائی والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اور چراغ سے چراغ جلنا ایسا ضروری تھا جس سے ان کو اپنا گھر اپنا سہاگ خطرے میں نظر آتا تھا۔آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی اولاد نہ ہونے کی تمام ذمہ داری عورت ہی کی تسلیم کی جاتی ہے جبکہ اولاد کا پیدا ہونا نہ ہونا خالق دو جہاں کے ہاتھ میں ہے۔

بچے کی پیدائش کی خوشی دونوں گھروں میں دھوم دھام سے منائی گئی مٹھائیاں بٹیں۔ غریبوں کو کھانا کھلایا گیا۔دادی اماں گھر سے شاز و نادر ہی کہیں آتی جاتی تھیں۔نومولود دیکھنے کے لئے بجیلہ کے گھر جانے کو تیار ہو گئیں ساتھ میں رحمت خالہ کو لے جانا نہیں بھولیں۔"لو آج میرے کیسے بھاگ کھلے کہ اماں کے قدم آئے۔" بجیلہ کی ساس نے دادی اماں کا استقبال کرتے ہوئے گرمجوشی سے کہا۔"کیا بتاؤں۔بہن جوڑوں کے درد نے لاچار کر دیا ہے۔بچے کا سن کر رہا نہیں گیا۔ تمھیں مبارک باد دینے جیسے تیسے آ گئی۔"

"اللہ ننہال والوں کو بھی مبارک کرے" کہہ کر دادی نے پوتا راحیلہ بیگم کی گود میں دے دیا۔"اللہ جیتا رکھے نیک نصیب ہو۔ماشاء اللہ کیسا ٹکر ٹکر دیکھ رہا ہے لو رحمت گود میں لو" دادی اماں نے بچے کو خالہ رحمت کی گود میں دیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"نہیں۔بہن برا مت ماننا میں کسی بے اولاد اور بانجھ کی چھاؤں بچے پر نہیں پڑنے دوں گی۔" بجیلہ کی ساس نے خالہ رحمت کی گود سے بچے کو لیتے ہوئے کہا۔الفاظ تھے یا پگھلا ہوا سیسہ

جو رحمت خالہ کے ساتھ ساتھ بلکہ اُن سے کچھ زیادہ ہی دادی اماں کو زخمی کرتے چلے گئے۔ وہ فوراً واپسی کے ارادے سے کھڑی ہو گئیں۔ ''بہن ناراض ہو گئیں میں نے بھلا ایسا کیا کہہ دیا وہ تو بچے کی خاطر..........''

''نہیں نہیں'' دادی اماں نے ہاتھ اٹھا کر ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا'' دراصل میری طبیعت خراب ہو رہی ہے چلو رحمت'' گھر آ کر دادی اماں کا موڈ سخت آف تھا۔ بہو مزاج داں تھیں۔ سمجھ گئیں بجیلہ کی ساس نے کوئی گل فشانی کی ہو گی۔

''اماں کیا ہوا کیوں چپ ہیں؟'' وجاہت کی دلہن نے استفسار کیا۔ ''چپ نہ ہوں تو کیا کروں خوشی خوشی گئی تھی اپنی بچی کے بچے کو دیکھنے۔ اس کی ساس کی زبان توبہ۔ اللہ کا خوف بھی دل سے اٹھ گیا ہے'' اماں نے ناراض لہجہ میں ہو کر جواب دیا۔ ''کیا کہا آخر انہوں نے'' وجاہت دلہن نے تفصیل میں جانا چاہا۔

''اے کہتی کیا؟ میں نے پیار کر کے بچے کو رحمت کی گود میں دیدیا۔ وہ نیلے پیلے دیدے نکال کر بولی'' میں بے اولاد کی چھاؤں بچے پر نہیں پڑنے دوں گی'' یہ کہہ کر رحمت کی گود سے بچے کو چھین لیا اب بتاؤ دلہن نگوڑی کے دل پر کیا بیتی ہو گی۔ جب ہی تو وہ میرے ساتھ یہاں تک بھی نہیں آئی گھر کے قریب بولی'' راحلہ بیگم مجھے یہیں اتار دو ہر چند میں نے منت کی راحلہ بیگم کے لہجہ میں اداسی بول رہی تھی۔

''بہت برا کیا دراصل لوگوں کے دلوں سے خوف خدا اٹھتا جا رہا ہے۔ بات کہنے سے پہلے سوچتے ہی نہیں کہ سامنے والے کے دل پر کیا گزرے گی بیچاری خالہ ہر کسی کے گلے گلے پانی کی شریک ہیں کتنا انکا دل دکھا ہو گا'' بہو نے تشفی دینا اپنا فرض سمجھا۔

راحیلہ بیگم ان خوش نصیب ماؤں میں تھیں جو اولاد کا سکھ دونوں ہاتھوں سے بٹورتی ہیں۔ وجاہت ان کے اکلوتے ناز پرور بیٹے تھے۔ حسن صورت و سیرت سے مالا مال۔ باپ کا انتقال تو صغیر سنی میں ہو گیا تھا اس وقت وہ میٹرک کے اسٹوڈینٹ تھے۔ وہ ماں سے بے پناہ پیار کرتے تھے۔ راحیلہ بیگم کو فخر تھا کہ ان کا بیٹا ان سے پوچھے بنا سانس لینا بھی گوارہ نہیں کرتا ہے رات کو سوتے سے اٹھ اٹھ کر ماں کو دیکھ جاتا ہے۔ انہیں بیٹے کی شادی کا بڑا ارمان تھا اکثر لوگ کہتے بھئی

وجاہت شادی کے بعد بھی ایسا رہے تب کی بات ہے۔ شادی کے بعد تو اچھے اچھے اس طرح دیدے پھیرتے ہیں کہ روایتی نے مروت طوطا بھی دنگ رہ جاتا ہے۔ راحیلہ کے دل میں بھی شک کے ناگ پھن اٹھانے لگے ایک روز شک کا اظہار وجاہت کے سامنے کر گزریں۔

''ارے اماں آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے بیوی جب چاہوں مل سکتی ہے لیکن یہ میری پیاری پیاری ماں نہیں مل سکتی۔ اور پھر جیسا انہوں نے کہا تھا کر کے دکھایا نبیلہ سے پہلے ہی دن کہہ دیا ''میری خوشی میری ماں کی خوشی میں مضمر ہے وہ اگر دن کو رات کہیں تو تم تاروں کی نشاندہی کر دینا۔ باقی میں کبھی تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔'' نبیلہ شریف والدین کی اولاد تھی شوہر کی نصیحت کو پلو میں باندھ لیا۔ ساس بہو کا روایتی جھگڑا کبھی نہیں ہوا۔ ایک دوسرے کی مزاج داں بنتی گئیں۔ خامیوں کی پردہ پوشی دونوں ہی نے اپنا فرض مانا۔ رفتہ رفتہ ساس نے اپنے اختیارات سعادت مند بہو کو سونپ دیے ایک ایسا مثالی گھر بن گیا جو دوسروں کے لئے قابلِ تقلید تھا۔

وقت کا پنچھی پر لگا کر اڑتا رہا وہی شب و روز تھے چند روز سے راحیلہ بیگم کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی تھی۔ ویسے بھی بڑھاپا از خود ایک بیماری ہے۔ رحمت خالہ کا آنا جانا کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ دادی اماں کے اس فرمان پر کہ ''رحمت کا ادب کیا کرو'' گھر کے سبھی ممبر عمل پیرا تھے۔ لیکن خالہ کو دیکھتے ہی ندیم کی زبان میں کھجلی ہونے لگی۔ ادھر خالہ نے گھر میں قدم رکھا ادھر اس کی بیٹری چارج ہوئی۔ وہ بڑی چاہ سے خالہ کے پاس آ کر بیٹھتا اور پھر اس کے جملوں پر امی پاپا تک کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ آ جاتی اور کبھی دادی اماں بھی منہ پر دوپٹہ رکھ لیتیں۔ ''خالہ! پتہ ہے آپ بیمار کیوں نہیں ہوتیں'' سنجیدگی سے ندیم کا سوال آتا۔ ''اے مجھے کیا پتہ۔'' خالہ کہتیں۔

''مجھے پتہ ہے آسمان سے جب کوئی بیماری اترتی ہے تو آپ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے کسی مرغی، کبوتر یا بلی کے بچے پر گر پڑتی ہے اور آپ بال بال بچ جاتی ہیں۔'' ندیم کی سنجیدگی اللہ کی پناہ۔ ''اے سچ کہا بچے! جبھی تو کہوں یہ آئے دن مرغیاں بیمار کیسے پڑتی ہیں کل سے شیرازی بھی دانہ نہیں کھا رہا ہے۔ بڑے بوڑھے ٹھیک ہی کہتے تھے گھر میں کوئی نہ کوئی جناور (جانور) ضرور ہونا چاہیے'' خالہ مسکنیت سے ندیم کے بے سروپا جھوٹ پر فوراً ایمان لے آتیں۔

دن ہنسی خوشی بیت رہے تھے کہ دادی اماں کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی وہ خالہ

رحمت سے سرگوشیوں میں نہ جانے کیا باتیں کرتیں۔ گھر والوں کو اس سے کچھ سروکار نہ تھا۔ انہیں تو فکر تھی کہ دادی اماں جلدی سے اچھی ہو جائیں۔ ندیم بڑی جانفشانی سے دادی کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ وجاہت خاں اور نبیلہ رات کو اٹھ اٹھ کر دیکھتے۔

ایک صبح ناشتے سے فارغ ہو کر انہوں نے بہو بیٹے کو قریب بلایا۔ ''وجاہت اور دلہن میری بات دھیان سے سنو مجھے لگتا ہے میں اب زیادہ نہیں جیوں گی'' ''کیا کہہ رہیں ہیں اماں۔'' وجاہت نے بات کاٹتے ہوئے گلوگیر لہجہ میں کہا۔ ''اب تو بلڈ پریشر بھی نارمل ہے۔ کیوں ایسی باتیں کرتی ہیں۔'' بہو نے قریب آکر اپنا فرض نبھایا۔ ''نہیں بیٹی کچھ نارمل نہیں ہیں تم نے سنا نہیں ہے۔'' ''بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے۔''

''یہ دار فانی ہے ہر ذی روح کو ایک نہ ایک دن یہاں سے جانا پڑتا ہے بس خدا آگے کی آسانی کرے میں ایک بہت بڑا بوجھ لے کر یہاں سے جاؤں گی برسوں سے بے کل ہوں اور پر جانے کون سی سزا کی حقدار ٹھہروں گی۔'' اماں یہ سب آپ کیا کہہ رہی ہیں میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بوجھ اور آپ۔ آپ کی ساری زندگی شیشے کی طرح اجلی ہے۔ آپ نے کس کس طرح میری پرورش کی ہے مجھے آپ جیسی ماں پر فخر ہے۔ وجاہت نے ماں کے دونوں ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا لیئے۔

''بیٹا تم کچھ نہیں جانتے وہ کون سا راز ہے جو ہر دم میری روح کو کچو کے لگاتا ہے چاہتی ہوں تم سب سے کچھ کہہ دوں شاید اسی طرح روح کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

''اماں کیا کہنا چاہتی ہیں کہہ ڈالیئے۔'' بہو غمناک آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ دریچہ ماضی وا ہوا۔ راحیلہ ایک بڑے رئیس زمیندار کی اکلوتی بیٹی حسن و جمال میں یکتا۔ رشتوں کی کیا کمی ٹکرے کے رئیس خاندان میں بیاہی گئیں۔ سوئے اتفاق شجاعت علی خاں بھی گھر کے واحد چشم و چراغ تھے دنیا کی ہر خوشی حاصل تھی۔ چاہنے والا شوہر ناز اٹھانے والی ساس خدمت کے لئے درجنوں ملازم۔ خوشی کے ہنڈولے میں جھولتے دو سال ایسے گزرے کے پتہ ہی نہ چلا۔ راحیلہ بیگم کی گود ہنوز خالی تھی۔ ادھر دادی کو پوتا پوتی کھلانے کی آرزو روز بروز ترقی پر تھی۔

دوا علاج تعویز گنڈے کیئے گئے۔ دیہاتی زندگی تھی نہ اس وقت تک سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی میاں بیوی کے ٹیسٹ ہوتے نہ رواج تھا۔ دیکھتے دیکھتے پانچ سال بیت گئے۔

ساس کی نظریں بدلنا شروع ہو گئیں۔ وہ گھنٹوں جائے نماز پر بیٹھی مالک حقیقی کے سامنے گڑگڑاتیں الٰہی مجھ پر رحم کر اپنی قدرت کاملہ سے ایک جیتا جاگتا بیٹا عطا کر دے۔

ساس بیٹے کی دوسری شادی کے درپے تھیں۔ وہ اپنی زندگی میں جائداد کا وارث چاہتی تھیں۔ وہ بیٹے کو سمجھا بجھا کر دوسری شادی پر رضامند کرنے کی کوشش کرتیں۔ شجاعت تذبذب کا شکار تھے۔ وارث کی ضرورت وہ بھی شدت سے محسوس کرتے لیکن دوسری طرف وہ راحیلہ کو بھی دل سے چاہتے تھے۔ کیا کریں کیا نہ کریں ساس نے طعنوں تشنوں سے بہو کا کلیجہ چھلنی کر دیا تھا۔

وہ گھنٹوں جائے نماز پر بیٹھی مالک حقیقی کے سامنے گڑگڑاتیں الٰہی مجھ پر رحم کر اپنی قدرت سے ایک بیٹا عطا فرما دے۔

اچانک نہ جانے کیا ہوا شجاعت کئی کئی روز گھر سے غائب رہنے لگے۔ اکثر رات کے پچھلے پہر حویلی میں داخل ہوتے اور خاموشی سے لیٹ کر سو جاتے۔ ساس نے بھی بہوں کو دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھرنا چھوڑ دیں۔ گھر میں عجیب سی خاموشی در آئی تھی۔ راحیلہ بیگم کے دل پر پنکھے لگنے لگے ان کو یہ خاموشی طوفان سے پہلے کی نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے شوہر سے ڈرتے ڈرتے پوچھنا چاہا لیکن وہاں ایک جامد چپ تھی۔ راحیلہ بیگم کو محسوس ہوتا خزاؤں نے ان کے صحن میں ڈیرہ ڈال لیا ہو۔ وقت تو بہر حال گزرنا ہی ہوتا ہے ایک سال دبے پاؤں گزر گیا۔ اچانک ساس پر فالج کا زبردست حملہ ہوا ایک ہاتھ اور ایک پیر مفلوج ہو کر رہ گیا۔ راحیلہ بیگم نے سارے شکوے بھلا کر دل و جان سے خدمت کی۔ بڑی بی پچھلے سلوک پر شرمندہ تو کیا ہوتیں بہر حال متاثر ضرور ہوئیں۔

ایک شام حسب معمول راحیلہ بیگم ساس کی مالش کر رہی تھیں کمرے کا پردہ اٹھا کر شجاعت اندر داخل ہوئے ان کے ساتھ گلابی کپڑوں میں ملبوس کالی چادر اوڑھے ایک بیس بائیس سالہ لڑکی ایک نوزائدہ بچہ گود میں اٹھائے ہوئے تھی۔ راحیلہ بیگم کو محسوس ہوا کمرے کی دیواریں ان پر دھماکے سے آ رہی ہوں انہیں اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ طوفان آ چکا تھا اب اس کی منہ زور لہروں سے مقابلہ کرنا تھا۔

اپنے کمرے میں آ کر وہ بیڈ پر اوندھی لیٹ گئیں ''آہ میرے خدا یہ کیا ہوا'' وہ بلک بلک کر رو پڑیں ''راحیلہ بیگم'' ایک اجنبی آواز کمرے میں گونجی۔ راحیلہ بیگم نے سر اٹھا کر آنسو بھری

آنکھوں سے دیکھا وہی لڑکی بچے کو ہاتھوں میں اٹھائے بیڈ سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔

''کیوں آئی ہو میرے کمرے میں میری بربادی کا تماشہ دیکھنے۔ نکل جاؤ۔'' وہ جذباتی انداز میں چیخیں۔ ''بیگم صاحبہ آنسو پونچھ لیجئے میں آپ کو کچھ دینے آئی ہوں۔'' اس کے سکون میں رتی بھر فرق نہیں آیا۔ ''دینے! شوہر چھین کر میری بسی بسائی زندگی کو اجاڑ کر مجھے کچھ دینے آئی ہو۔ خوب'' راحیلہ بیگم کا بس ہوتا تو ابھی اس لڑکی کو بچے سمیت شوٹ کر دیتیں۔

''نہیں نہیں میں آپ کا گھر اجاڑنے نہیں روشن کرنے آئی ہوں۔ میں منشی غلام محمد کی بیٹی ہوں ماں بچپن میں چل بسیں۔ میرا بابا کے علاوہ اس بھری پری دنیا میں کوئی نہیں تھا وہ ٹی بی کے مریض تھے۔ شجاعت صاحب ازراہِ غریب پروری روپیہ پیسہ سے مدد دیتے تھے۔ میرے بابا کو میری فکر تھی ایک روز صاحب ہمارے یہاں آئے۔

''میرے بعد اس بھری دنیا میں میری بچی کا کیا ہوگا'' بابا نے ہزار بار کا رٹا ہوا جملہ ایک بار پھر دہرایا۔ ''میں تمہاری بچی کو سہارا دوں گا اسے اپنی پناہ دوں گا۔'' شجاعت صاحب نے کچھ دیر سوچ کر بابا سے کہا۔

''اسی شام میرے بابا نے سکون سے آنکھیں موندلیں۔ وہ میری فکر سے آزاد ہو گئے مجھے سب پتہ ہے بیگم صاحبہ آپ کی گود سونی ہے میں نے اس کے دنیا میں آنے سے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ آپ کی امانت ہے۔ میں کبھی بھی آپ کے راستہ میں آنے کی ہمت نہیں کروں گی۔ مجھ سے صاحب نے نکاح ضرور کیا ہے لیکن میں اپنا مقام پہچانتی ہوں۔ شجاعت صاحب نے مجھ لاوارث کو جو پناہ دی ہے اس کا احسان تو میں مر کر بھی نہیں چکا سکتی۔'' اتنا کہہ کر اس نے بچہ گود میں ڈال دیا۔

''یہ رہی آپ کی امانت۔''

لگتا تھا میری قوت گویائی سلب ہو چکی ہے میری آنکھیں اس پر مرکوز تھیں۔ وہ ملتجی نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ ''لیکن تم اپنا بچہ مجھے کیوں دے رہی ہو۔ پھر تم کیا کرو گی'' الفاظ ٹوٹ کر میرے ہونٹوں سے ادا ہوئے۔ میں! اگر قدرت نے اور دیدیا تو ٹھیک ورنہ ایسے ہی جی لوں گی۔'' وہ ہنسی کتنا کرب تھا اس ہنسی میں ماں اپنا لخت جگر اپنے ہاتھوں دوسری عورت کو سونپ

رہی تھی۔ایک مرد کے دیئے ہوئے سہارے کا قرض اتارنے کے لئے۔

''بس آپ مجھ سے ایک وعدہ کیجئے آپ کبھی بھی کسی حالت میں بھی اس کو یہ نہیں بتائیں گی کہ اس کی اصل ماں کون ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ رکی نہیں تیزی سے پلٹ کر کھلے دروازے سے نکلتی چلی گئی۔راحیلہ بیگم سکتے سی کی کیفیت میں بیٹھی رہ گئیں کہ اچانک بچے کے رونے کی آواز سے وہ حال میں لوٹ آئیں۔ بچہ ماں کی گود کی گرمی نہ پا کر رو رہا تھا۔روتے ہوئے بچے کو گود میں لے کر وہ ساس کے کمرے میں آئیں۔''اماں یہ سب آخر کیا ہے'' انہوں نے ساس سے استفسار کیا۔

''بیٹی یہ تیری دُعاؤں کی قبولیت ہے۔ تیرے صبر کا پھل ہے۔ کفرانِ نعمت مت کر لگالے سینے سے میرے شجاعت کے بچے کو اپنے بچے کو۔'' پھر ان کی زندگی میں بہاروں نے اپنا ڈیرہ ڈال لیا۔ وہ تن من دھن سے اپنے بچے کی ناز برداریوں میں جٹ گئیں۔ اس کی معصوم شرارتوں پیار بھری باتوں میں اپنا آپ بھول گئیں انہیں یہ بھی یاد نہ رہا اس مظلوم عورت کو خدا نے دوبارہ اولاد کی دولت سے نوازا بھی یا نہیں۔انہوں نے دوبارہ اس کی شکل تک نہ دیکھی نہ کبھی شجاعت خاں نے ذکر کیا۔

ماہ و سال گزرتے رہے ان گزرتے لمحات میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔شجاعت خاں نے زمین جائداد بیچ کر دیہات کی بود و باش ترک کر کے شہر میں سکونت اختیار کر لی۔روپیہ بزنس میں لگادیا۔شہر کی سکونت کی بڑی وجہ وجاہت کی تعلیم تھی وہ گھر سے دور ہاسٹل میں رہ رہے تھے ابھی وہ انٹر میں ہی تھے کہ ایک رات شجاعت خاں کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ڈاکٹروں کی انتھک کوششوں سے کچھ دیر کو ہوش آیا۔

''راحیلہ اس بد نصیب کو بھی میں نے شہر ہی میں گھر لے کر آباد کر دیا ہے۔اس کی گود آج بھی سونی ہے۔ایک بچے کے بعد اللہ نے اسے کوئی اولاد نہیں دی میرے بعد وہ بالکل بے سہارا ہو جائے گی۔مجھ سے وعدہ کرو تم ایک بہن کی طرح اس کا خیال رکھو گی۔ٹوٹتی سانسوں کے درمیان انہوں نے بیوی سے عہد لیا اور پھر موت کی بے رحم وادی میں ابدی نیند سو گئے۔

''اماں وہ کہاں ہیں'' کمرے کی گمبھیر خاموشی کو وجاہت خاں کی آواز نے توڑا ان کی

آنکھیں غمناک تھیں کچھ یہی حال ان کی بیوی کا تھا۔ ندیم اور شمامہ ساکت نظروں سے اپنی محترم دادی کو دیکھ رہے تھے۔ ''ارے سب کے سب کہاں چھپے بیٹھے ہو'' دالان سے خالہ رحمت کی آواز آئی سب کے اترے ہوئے چہرے دیکھ کر وہ چکرائیں۔

''راحیلہ بیگم کیسی ہو کچھ تم ہی منہ سے کہو کیا سب کے منہ میں گھنگھنیاں بھری ہیں۔ خالہ نے اپنی لغت سے ایک اور محاورہ اٹھایا۔ ''رحمت ادھر آؤ میرے قریب بیٹھو۔ وجاہت یہ ہے تمہاری بدنصیب ماں اس کی بے لوث محبت پاکیزہ جذبات کی قدر کرو۔ اس نے میری گود آباد کی اور خود تنہائیوں کا زہر پیتی رہی۔ اپنا گھر جلا کر میرے گھر میں روشنی کی۔ اس زمین پر بے رحمی سنگدلی، گنہگاری، فحاشی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ قیامت کو آجانا چاہئے۔ ایسے میں رحمت جیسی پاکیزہ اور بے لوث ہستیاں بھی ہیں۔ جن کی بدولت زمین آسماں اپنی جگہ قائم ہیں۔ تمہارے بچے پوچھتے خالہ روز کیوں آتی ہیں اور آتے ہی پاپا کو پوچھتی ہیں۔ یہ اپنی پیاسی تمنا کو سیراب کرنے آتی ہے اپنے دور افتادہ بچے کو دیکھنے آتی رہی۔ یہ اس خودغرض دنیا کی وہ عظیم عورت ہے جو اگر چاہتی تو میرا گھربار تاراج کر کے اپنے بیٹے کے ساتھ عیش کرتی لیکن اس نے تو مجھے بھی کچھ نہ بتانے کے عہد کا پابند کر دیا تھا۔ وجاہت خاں خالہ رحمت کی بانہوں میں اختیار رو رہے تھے۔ راحیلہ بیگم کے دل کا برسوں کا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ مانو ان کی روح ہلکی پھلکی ہو کر ہوا میں تیر رہی ہو۔

ممتا کی صلیب

وہ ایک غبار آلود شام تھی۔ ڈیوٹی اتفاق سے آف تھی۔ ''یار عجیب بوریت ہو رہی ہے چلو کہیں گھوم گھوم آئیں'' بیٹھے بیٹھے صحرانوادی کا دورہ کیوں پڑتا ہے اور اطلاعاً عرض ہو آج میرا آف نہیں دوسرے موسم کے تیور دیکھ رہے ہو۔ انجان جگہ کہیں طوفانی بارش نے آلیا تو گھومنے کا بخار اتر جائے گا۔'' ناصر کا جواب خاصہ طویل تھا۔

''یار موڈ غارت مت کر لا بائیک کی چابی نکال۔'' ٹھیک ہے بابا لیکن اگر طوفان میں گھر گیا تو میں ڈھونڈنے نہیں جاؤں گا۔'' میں نے اس کی بکواس پر دھیان دیئے بنا بائیک اسٹارٹ کی اور اس حسین سڑک پر چل پڑا جو بل کھاتی ہوئی سیدھی مال روڈ تک جاتی تھی۔ ہاؤس جاب مکمل کر کے پہاڑ کے دامن میں بسے اس خوبصورت مقام پر ہم دونوں نے نیا نیا چارج لیا تھا ہاسپٹل بہت ہی پُر فضا مقام پر تھا۔ چاروں طرف گل پوش پہاڑیاں، قریب ہی گنگناتا ہوا ایک جھرنا، نشیب وفراز کے بیچ میں ''در الشفاء'' یہ ایک پرائیوٹ ہاسپٹل تھا۔ نواب احمد یار خاں مرحوم کے جواب کی تعبیر جو ایک بڑے جاگیر دار تھے اور لاولد ہونے کی شکل میں اپنا تمام اثاثہ اس ہاسپٹل کے لئے وقت کر گئے۔

میں کچھ دیر بے مقصد ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ ضرورت کی چند اشیاء بھی خریدیں اور واپسی کے لئے بائک موڑی۔ اچانک آسماں کو سیاہ بادلوں نے ہر طرف سے ڈھانپ لیا۔ وقت سے پہلے اندھیرا ہونے لگا۔ موٹی موٹی بوندوں کے ساتھ تیز ہوا بھی چلنے لگی۔ ایسے میں بائک چلانا دشوار تھا میں نے اطراف میں نگاہ ڈالی شاید کوئی جگہ اس طوفان میں عارضی پناہ گاہ کے طور پر نظر آجائے۔

وہ غالباً کوئی بوسیدہ حویلی تھی، بمشکل بائک کو کھینچ کھانچ کر اس کے چھجے کے نیچے لایا۔ سر تا پا بارش میں شرابور ہو چکا تھا طوفانی ہوائیں تیز ہوتی جارہی تھیں۔ کاش میں نے ناصر کی بات مان لی ہوتی۔ سوچا دروازے پر دستک دوں شاید اندر بیٹھنے کی جگہ مل جائے پھر ذہن میں آیا خدا جانے کون لوگ ہوں دروازہ کھولیں بھی یا نہیں کس طرح پیش آئیں یا پھر سرے سے حویلی خالی

ہو۔اچانک لائٹ آف ہوگئی ہرطرف اندھیرا گھپ۔غیرارادی طور پر میں نے زوردار دستک ڈالی دوسری اور پھر تیسری، اندر سے آواز آئی۔کون ہے بھئی؟ یہ آواز نسوانی تھی۔

''دروازہ کھولئے بارش کے رکنے تک بیٹھنے کے لئے جگہ دے دیجئے۔'' ''ٹھہرو'' اندر سے دوبارہ کہا گیا یہ وقفہ صدیوں پر بھاری ہوگیا۔بارش نے بھگو کر ہواؤں کی نذر کرنا شروع کر دیا تھا۔کھٹکے سے دروازہ کھلا لیمپ لیے ہوئے ایک نسوانی ہیولا نظر آیا۔'' کون ہو؟ اس طوفان میں بھی چین نہیں ہے۔ہم کسی سے نہیں ملتے'' کہہ کر اس نے دروازہ بند کرنا چاہا میں نے فوراً اس کا ارادہ بھانپ کر دروازہ بند کرنے کی کوشش کو ناکام کرتے ہوئے جلدی سے کہا'' محترمہ میں کوئی چور اچکا نہیں ہوں ایک ڈاکٹر ہوں صرف کچھ دیر کے لئے سایہ درکار ہے''

''اچھا دو منٹ ٹھہرو۔'' کہہ کر محترمہ اندر غائب ہوگئیں اور یہ دو منٹ دو صدیوں سے بھاری لگے۔خدا خدا کر کے خاتون دوبارہ ظاہر ہوئیں اور مجھے اندر لے گئیں۔میں نے سرسری نظروں سے خاتون اور کمرے کا جائزہ لیا۔یہ غالباً پرانے زمانے کا ڈرائینگ روم تھا جس میں ایک بوسیدہ صوفہ چند پرانی کرسیاں مکینوں کی زبوں حالی کی کہانی سنا رہی تھیں۔خاتون پرکشش چہرے والی پچاس سالہ کسی اچھے خاندان کی فرد نظر آتی تھیں مجھے لگا وہ بھی میری طرف بغور دیکھ رہی ہوں۔

''معافی چاہتا ہوں آپ کو بے وقت پریشان کیا دراصل بارش کی وجہ سے کسی سائے کی ضرورت تھی۔'' میں نے معذرت کی۔

''کوئی بات نہیں بیٹھ جاؤ۔'' کہہ کر ڈرائینگ روم میں کھلنے والے دوسرے دروازے سے اندر چلی گئیں میں نے جیب سے رومال نکال کر چہرہ اور بھیگے بالوں کو پونچھا۔اچانک دروازے کا پردہ ہٹا اور وہی خاتون ہاتھ میں ٹرے لئے اندر داخل ہوئیں ان کے ساتھ ایک دوسری خاتون بھی تھیں جو شکل وصورت میں کسی حد تک پہلی سے مشابہ تھیں۔میں احترام کھڑا ہوگیا۔

''بیٹھو بیٹا چائے لو اس طوفانی موسم میں کہاں سے آرہے ہو کہاں جانا ہے'' دوسری خاتون نے شفقت سے کہا۔''شکریہ آپ نے چائے کی ناحق تکلیف کی'' میں نے تکلفاً کہا۔''نہیں بیٹا لے لو بری طرح بھیگ گئے ہو۔'' میں نے چائے کا کپ اٹھالیا۔خاتون نے ایک بار پھر اپنا سوال دوہرایا۔

''آنٹی میرا نام شہر یار ہے'' درالشفاء میں ایک مہینہ پہلے چارج لیا ہے۔ بور ہو رہا تھا سوچا تھوڑی آؤٹنگ کرلوں واپسی پر اس طوفان نے گھیر لیا اور آپ کی زحمت کا باعث بنا'' میرا جواب تھا۔ ''نہیں زحمت کیسی زحمت بس یہاں ہم لوگ اکیلے رہتے ہیں کوئی مرد نہیں ہے اسی لئے احتیاط سے کام لیتے ہیں'' خاتون نے وضاحت کی۔ بات کرتے کرتے انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا۔ خدا جانے انہیں میرے چہرے میں کیا نظر آیا کہ وہ مضطرب دکھائی دینے لگیں۔ وہ بار بار دیکھتیں آنکھوں میں اضطراب کروٹیں لیتا نظر آتا۔

بارش کی رفتار میں کمی آگئی تھی میں کھڑا ہو گیا۔ ''آنٹی اس مہربانی کے لئے آپ دونوں کا بہت بہت شکر یہ ایک بار پھر اس زحمت کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ ''نہیں بیٹا معافی کا ہے کی لیکن تم کچھ خیال نہ کرنا اس وقت تو تم مجبوری میں یہاں آئے کیا آئندہ بھی ہمیں یاد رکھو گے اور وقت نکال کر ضرور آؤ گے'' خاتون کا لہجہ ملتجی تھا۔ ''جی ضرور کوشش کروں گا'' کہہ کر میں نے باہر آ کر بائک اسٹارٹ کی۔

راستے بھر میں ان کے متضاد سلوک پر غور کرتا رہا پہلی خاتون کا جملہ ہم کسی سے نہیں ملتے'' اور دوسری محترمہ کا کہنا کہ'' آتے رہنا ذہن میں بس گونجتے رہے۔ سوچتا ہوا اسپتال پہنچ گیا۔

حسب توقع ناصر بھرا ہوا میرا منتظر تھا۔ دیکھتے ہی شروع ہو گیا۔ ''یار بڑا سخت جان ہے میں تو سمجھا تھا طوفان کی نظر ہو گیا ہو گا۔ تجہیز و تکفین کے بارے میں سوچ رہا تھا طوفان میں مر کہاں گیا تھا؟''

یار تو کیسا دوست ہے ہمیشہ اپنی کالی زبان سے کالے کلمے ہی نکالتا ہے۔ مریں میرے دشمن ابو کا اکلوتا نور چشم ہوں۔ تیری طرح چھ بھائیوں کا گلہ نہیں ہے۔'' میں نے اس کی گفتگو پر فل اسٹاپ لگایا۔

اس موسم میں سیر کو جانے کو کس کمبخت نے کہا تھا ایک تو پیٹ میں چوہوں کے ساتھ شاید بلیاں بھی اُچھل کود میں مشغول ہیں۔ میں غریب بھوکا پیاسا بیٹھا صاحب بہادر کا انتظار کر رہا تھا'' ناصر کا غصہ عروج پر تھا۔

''چل بابا چل تو تو ازلی بھوکا ہے'' کہہ کر میں اس کو لے کر کانٹین کی طرف چل پڑا۔

رات جب میں سونے لیٹا ذہن میں دونوں اجنبی عورتوں کا ہیولا گردش کر رہا تھا۔ کون ہیں؟ اس سنسان حویلی میں کسی طرح تنہا رہتی ہیں؟ چہرے مہرے سے کسی اچھی خاندان کی لگتی ہیں۔ سوچتے سوچتے بالآخر میں نیند کی وادی ہیں اتر گیا میں ایک ایسے پیشے سے وابستہ تھا جہاں دن بھر سینکڑوں مرد عورت نپٹنے آتے رہتے ہیں کس کس کی شکل کو یاد رکھا جائے رفتہ رفتہ دو ہفتے بیت گئے ایک شام میں اور ناصر اُسی راستے پر جا رہے تھے جہاں طوفانی رات میں میں نے پناہ لی تھی۔ ''یار ناصر وہ سامنے حویلی دیکھ رہے ہو میں اس روز بارش سے بچنے کے لئے یہیں رکا تھا دو معمر عورتیں ہیں انہوں نے مجھے چائے بھی پلائی تھی۔''

ناصر نے بائک روک لی اور غور سے دیکھنے لگا۔ ''یہ کوئی بھوت بنگلہ نظر آتا ہے کہیں تم بدروحوں کے چکر میں تو نہیں آ گئے کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ '' کیا جاہلانہ بکواس ہے ان شریف عورتوں نے مجھے دوبارہ آنے کو بھی کہا ہے میں نے وضاحت دی۔ ''بس بس میں سمجھ گیا۔ وہ کافی دنوں کی بھوکی ہوں گی پلا پلایا تگڑا جوان مل بانٹ کر کھائیں گی۔'' ناصر نے شوخی سے کہا۔

''کیا بکواس ہے چلوا ایک بار مل کر آتے ہیں بائک موڑ''''نہیں میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ بھوتوں چڑیلوں کی دعوت تجھے ہی مبارک ہو مجھے کنوارہ مرنے کا ہرگز شوق نہیں ہے'' ناصر نے کہا۔

چل چل اگر مریں گے تو دونوں ساتھ ساتھ کہہ کر میں نے حویلی کا رخ کیا۔ میں نے غور سے حویلی کا جائزہ لیا اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی جگہ جگہ سے پلاسٹر ادھڑ چکا تھا اور اینٹیں نظر آ رہی تھیں۔ کہیں کہیں اینٹوں نے بھی جگہ چھوڑ دی تھی۔ دروازے پر کال بیل کی جگہ زنگ آلود کنڈی تھی۔ میں نے زور سے دستک دی ''کون ہے'' اندر سے ایک نغمہ بار آواز آئی۔

''یہ تو کسی لڑکی کی آواز ہے وہ معمر عورتیں کہاں ہیں'' ناصر نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

ناصر کو خاموش رہنے کا اشارہ دے کر میں نے اونچی آواز سے کہا'' میں ڈاکٹر شہریار ہوں'' ''ٹھہریئے'' پھر ایک نغمہ ابھرا۔ اب بھی چل نکل وہ کئی ہیں اور ہم صرف دو گوشت اور خون کی بانٹ پر جھگڑا ہوگا۔'' ناصر پھر آہستہ سے بولا۔ میں اس کو صرف گھور کر رہ گیا۔

دروازہ کھلا اور ہم دونوں نے اندر قدم رکھا دونوں ہی خواتین نے میرا اور ناصر کا خیر مقدم اس طرح کیا جیسے کسی قریبی عزیز کی پزیرائی کی جاتی ہے۔

''بیٹا تم وعدہ کر کے گئے تھے میں نے ہر دن تمہاری راہ دیکھی تم شاید ادھر کا راستہ ہی بھول گئے'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''ناصر میری طرف شرارت سے دیکھ کر مسکرایا۔'' آنٹی صرف دو ہفتے ہی تو گزرے ہیں اس رات جو زحمت آپ کو دی اس پر اب تک شرمندہ ہوں'' میں نے سکون سے جواب دیا۔

''ہنہ'' دو ہفتے انہوں نے ایک سرد آہ کھینچی۔

میرے استعجاب کا ٹھکانہ نہیں تھا ایک راہ چلتا انسان جس نے بارش سے بچاؤ کے لئے کچھ دیر کے لئے یہاں پناہ لی اس کا انتظار ایک ایسی ہستی جو اس کی ماں کے برابر ہو اس قدر بے قراری سے کرے۔

''میں آپ کی اس محبت اور شفقت کے لئے بہت ممنون ہوں۔'' میں نے نرم لہجہ میں کہا ''یہ تمہارے ساتھ کون ہیں؟'' انہوں نے ناصر کے بارے میں استفسار کیا۔ ''میرے عزیز دوست اور کولیگ ناصر ہیں'' میرا جواب تھا۔

''تم لوگ بیٹھو میں ابھی آئی کہہ کر وہ اندرونی کمرے کی طرف چل دیں۔

''بھاگ لے بیٹا مجھے تو کچھ اور ہی معلوم ہوتا ہے اور ہاں وہ نغمہ بار آواز والی حسینہ کدھر ہے'' ناصر نے سرگوشی کی۔

''بھلا کیا معلوم ہوتا ہے؟ میں نے مستفسرانہ انداز میں کہا۔

''یہ بدروحوں کا مسکن ہے جو عرصہ سے بھوکی پیاسی رہ رہی تھیں ہم دو تگڑے جوانوں کی شکل میں انکا رزق اترا ہے'' ناصر نے کہا۔

''تجھ سے بڑا بھوت کون ہوگا جہاں تو موجود ہو۔ وہاں بھوت بیچارے ٹک سکتے ہیں، اچھا خاموش بیٹھ میں نے آہٹ سن کر ناصر کو خاموش کیا۔ خاتون ہاتھوں میں ٹرے تھامے اندر آئیں ٹرے تپائی پر رکھ کر سامنے سنگل صوفے پر بیٹھ گئیں۔ چائے کے ساتھ چند لوازمات بھی تھے۔

''آنٹی اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی'' میں نے شرمندگی سے کہا۔ ''تکلیف کیسی بیٹا تمہارا اپنا گھر ہے'' ان کا لہجہ شہد آگیں تھا دوسری خاتون بھی آگئیں چائے کے دوران رسمی سی گفتگو ہوتی رہی لیکن اس دوران ان کی نظریں گہرائی سے میرا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ ادھر میں

برابر ناصر کی بے چینی کو محسوس کر رہا تھا۔

''بیٹا تم لوگ کہاں کے رہنے والے ہو'' اچانک سوال آیا۔

''جی ہم دونوں ہی کا وطن لکھنو ہے'' لکھنو کا نام سنتے ہی ان کا چہرہ متغیر ہو گیا اور آنکھیں مجھ پر مرکوز۔ آنٹی آپ دونوں یہاں حویلی میں تنہا کس طرح رہتی ہیں؟ آپ دونوں کا کیا رشتہ ہے؟ آپ لوگوں کے علاوہ بھی کوئی یہاں مقیم ہے'' ناصر نے ایک سانس میں کئی سوال کیے۔

''بیٹا جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے میرا نام عامرہ اور میری اس جڑواں بہن کا نام عذرا ہے، ہم دونوں اور عذرا کی بچی نغمہ ہی اس حویلی کو بسائے ہوئے ہیں'' ایک سرد آہ کے ساتھ جواب دیا۔

''آنٹی مائنڈ مت کرنا گزر بسر کا ذریعہ'' میں نے پوچھا۔

''نہیں بیٹا اتنا کچھ سہہ لیا ہے کہ مائنڈ کرنے نہ کرنے کی حس بھی مر چکی ہے'' میں سوال کر کے دل میں شرمندہ ہوا۔ معاف کرنا مجھے آپ سے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''نہیں بیٹا شرمندگی کی کوئی بات نہیں بس خدا اپنے بندے سے کسی حال میں غافل نہیں رہتا اور رزق کا تو بہر حال اس کا وعدہ ہے۔ وہ پتھر کے کیڑے کو رزق فراہم کرتا ہے ہم تو پھر انسان ہیں لاکھ گناہگار سہی لیکن اس سمیع و بصیر کی نظروں سے اوجھل نہیں ہیں''

ایک عجیب سا دکھ مجھے اپنے اندر اترتا محسوس ہوا۔ رسٹ واچ پر نظر ڈال کر میں نے ان کی طرف دیکھا اور اجازت چاہی اچانک ہی عامرہ آنٹی کی آنکھوں میں اضطراب نظر آنے لگا کچھ دیر پہلے کی شگفتگی غائب تھی۔

''نہیں بیٹا ابھی اور رکو ابھی تو آئے ہو'' میں نے اندازہ لگایا ان کے جملے بے ربط تھے۔ قریب بیٹھے ناصر نے آہستہ سے کہنی ماری یہ غالباً بھاگنے کا سگنل تھا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ کھڑی ہو گئیں بے قراری سے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر غور سے میری آنکھوں میں دیکھنے لگیں۔

''دیکھو عذرا ڈاکٹر شہریار یہی نام بتایا تھا نہ اتنی جلدی جا رہے ہیں'' مجھے ناصر کے کہے جملے یاد آنے لگے حالانکہ میں مافوق الفطرت عناصر پر یقین نہیں رکھتا لیکن پھر یہ کیا معاملہ ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں......اس سے زیادہ سوچنے کے لئے کچھ نہ تھا۔

ارے۔ارے ان کی پھیلی ہوئی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں اور ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ان کے گرتے وجود کو میں نے سہارا دیکر صوفے پر لٹا دیا ان کے پورے وجود پر کپکپی تھی سانس کی رفتار غیر متوازن اچانک میرے اندر کا ڈاکٹر جاگ اٹھا میں نے نبض تھام لی۔اس تمام عرصہ میں عذرا بیگم نہایت بے چین نظر آرہی تھیں ظاہر ہے جب حقیقی بہن اس حالت میں ہو تو پریشان ہونا لازمی ہے لیکن قابلِ حیرت بات یہ کہ انہوں نے مجھے ایسی عجیب نظروں سے دیکھا جس میں غصہ، ملامت اور نہ معلوم کیا کیا تھا۔

''ڈاکٹر گھبراؤ نہیں ان کو اکثر ایسے دورے پڑتے ہیں'' وہ تلخی سے گویا ہوئیں۔

کب سے ان کی یہ حالت ہے کس ڈاکٹر کا علاج ہوتا ہے'' ناصر نے بھی انسانی ہمدردی کے فرائض ادا کیے۔''ہنہ ڈاکٹر یہ سب ایک ڈاکٹر ہی کی تو دین ہے میرا بس چلے تو''

ان کے جملے سے میں کچھ اخذ نہ کر پایا میرے سامنے ایک کمزور عورت حواس سے عاری تھی مجھے اس کے لئے کچھ کرنا تھا۔میں ناصر کو رکنے کا کہہ کر تیزی سے باہر آیا بائک لے کر نزدیکی میڈیکل اسٹور سے دوائیں خریدیں اور واپسی کے لئے پلٹا۔

آنٹی ہوش میں آچکی تھیں لیکن معلوم ہوتا جسم کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو۔میں نے دوائیں عذرا آنٹی کو دیں۔اس میں سے ایک ٹیبلیٹ نکال کر دودھ کے ساتھ ان کو دیدی۔

''نہیں ڈاکٹر رہنے دو اپنی دوائیں یہ ایسے ہی ٹھیک ہیں'' ان کا لہجہ عجیب سا تھا۔میں عجب گومگو کے عالم میں تھا ناصر بھی کم بدحواس نہیں تھا۔

''بتایئے یہ سب کیا ہے؟ آپ لوگ کیسی زندگی گزار رہے ہیں اور اس پر مستزاد یہ بیماری'' میں نے استفسار کیا''میں اس وقت آپ لوگوں کو کچھ نہیں بتا سکتی بہتر ہے اس وقت آپ لوگ یہاں سے چلے جائیں'' ایک نظر بہن پر ڈال کر عذرا آنٹی نے تلخی سے کہا۔

ہم دونوں نے باہر آکر بائک اسٹارٹ کی اور ہاسپٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔خلاف معمول ناصر راستے بھر خاموش رہا اس کی خاموشی مجھے حیرت میں مبتلا کر رہی تھی۔

تالہ کھول کر ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔''یار سمجھ میں نہیں آتا تمہاری بیٹری کیسے ڈاؤن

ہوگئی یا پھر کسی بدروح کا سایہ ہوگیا۔'' میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا بتاؤں شہریار میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسی حسین لڑکی نہیں دیکھی۔'' ناصر بولا۔

''اے کیسی لڑکی اور تجھے کہاں نظر آ گئی اور تو حسن پرست کب سے ہو گیا۔'' مجھے اس کی دماغی صحت پر شبہ ہونے لگا۔

''پہلی پوری بات سنو جب تم دوا لینے گئے تھے میں ازراہِ ترحم خاتون کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا میں نے ایک گلاس پانی منگوایا۔ گلاس لیکر جو چہرہ طلوع ہوا وہ کم از کم اس زمین کا تو نظر نہیں آتا تھا۔ کوہِ قاف کی پری یا جنت کی حور کہنا صحیح ہوگا، ویسے میں شاعر تو نہیں ہوں جو تشبیہات ڈھونڈوں یا بقول شاعر نا معلوم۔ چلتا پھرتا تاج محل، سانسیں لیتا کشمیر کے مصداق تھی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی بڑی بڑی براؤن آنکھیں پانیوں سے بھری تھیں۔ وہ کچھ دیر ٹکٹکی باندھ کر بے ہوش خاتون کو دیکھتی رہی اور واپس پلٹ گئی۔ اب تو مجھے شک ہی نہیں یقین ہے یہ ضرور روحوں کا چکر ہے'' ناصر نے تفصیل سے آگاہ کیا۔

''لاحول ولا قوۃ، پھر وہی پاگل پن۔ میں کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔ میں نے ناصر کو دیکھتے ہوئے کہا۔'' ''کیا؟''

''کہیں ان کے ساتھ کوئی ایسا کاروبار تو نہیں جہاں نوجوانوں کو پھانس کر غلط راستوں پر ڈالا جاتا ہے۔ ایک خوبصورت لڑکی کی موجودگی بھی اس خیال کو مضبوط کر رہی ہے۔ اجنبی عورتوں کی لگاوٹ، بار بار آنے کی دعوت کوئی اور ہی کہانی سنا رہی ہے یہ کوئی لمبا چکر لگتا ہے''

''میں ایسا نہیں سمجھتا دونوں کے چہرے پر شرافت اور پاکیزگی نظر آ رہی تھی'' ناصر نے میرے خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

''ہائیں وہ بدروحوں سے عورتیں اور وہ بھی شریف اور پاکیزہ کیسے ہوگئیں ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر خیالات بدل گئے''

''ایسی بات نہیں ہے یا تو اچھی طرح جانتا ہے نہ میں حسن پرست ہوں اور نہ روحوں وغیرہ کا قائل۔ وہ سب تو تجھے وہاں جانے سے روکنے کی غرض سے کہا تھا ورنہ اس دور میں زمین انسانوں کے لئے تنگ ہوگئی ہے بھوت پریت کہاں آباد ہوں گے۔ ہوسکتا ہے یہ ہستیاں وقت کی

ٹھکرائی ہوئی ہوں۔ اور وقت کے ٹھکرائے ہوئے کو زمین کے اوپر مشکل ہی سے جگہ ملتی ہے۔"
ناصر کا اندازہ ناصحانہ تھا۔

"بہر حال میں ضرور اس اسرار کا پتہ لگاؤں گا ان کی گزر اوقات کے لئے کیا ذرائع ہیں چہروں سے کچھ نہیں ہوتا اکثر پاکیزہ چہروں کے پس پردہ سماج کے مکروہ چہرے ہوتے ہیں۔ مجھے شک ہے وہاں معاشرے کا کوئی ناسور ہے اگر ایسا ہے تو اس کو قانون کے حوالے کرنے کا فرض ہر شہری کا بنتا ہے۔ اور میں بھی اس فرض کو نبھاؤں گا۔"

"چھوڑ دو یار ہمیں کیا لینا دینا ایک تم ہی سماج کے ٹھیکیدار ہو۔ وہ جانے اور ان کا کام۔"
ناصر نے کہا۔

"صبح سنڈے تھا۔ رات کو دیر تک جاگنے کی بھی وجہ تھی دن چڑھے تک سوتا رہا۔ آنکھ تب کھلی جب ناصر جھنجھوڑ کر اٹھا رہا تھا۔" کیا ہے یار سونے بھی نہیں دیتے" مجھے ناصر پر غصہ آیا۔

"سونے کون کافر نہیں دیتا تمہارے گھر سے فون ہے فوری بلایا ہے" ناصر کا اتنا کہنا تھا نیند اور کسلمندی دونوں غائب میں نے فوری بستر چھوڑ دیا۔ تیاری کی اور جانے کے ارادے سے باہر نکلا ناصر ٹیکسی تک میرے ساتھ آیا۔" جاتے ہی فون کر دینا۔"

"وہ تو کروں گا ہی بس دُعا کرتے رہنا ابو ٹھیک ٹھاک ہوں خدا جانے کیوں بلایا ہے،
ناصر کے خدا حافظ کے جواب میں میں نے کہا۔

"راستے بھر خیالات کا ہجوم تھا خدا کرے ابو ٹھیک ہوں وہ شگر کے مریض ہیں حالانکہ ایک جانے مانے ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں لیکن امراض کا حملہ ڈاکٹروں پر بھی اسی انداز میں ہوتا جس طرح عام لوگوں پر۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید ڈاکٹر مرتے ہی نہیں یا پھر ان کی حادثاتی موت ہوتی۔ انہیں خیالات میں وقت گزرتا معلوم ہی نہیں ہوا اور لکھنو آ گیا۔ ٹیکسی لے کر گھر پہنچا لان میں ہی چھٹن بابا موجود تھے۔" السلام علیکم بابا خیریت تو ہے" میں نے بے تابانہ دریافت کیا۔

"جیتے رہو بیٹا دراصل بڑے صاحب کی طبیعت کئی روز سے خراب معلوم ہو رہی ہے پوچھنے پر کہتے ہیں بالکل ٹھیک ہوں بس اسی واسطہ میں نے فون کر کے تمہیں بلا لیا۔" بابا نے شفقت سے کہا۔" ہیں کدھر؟" میں نے اندر کی جانب بڑھتے ہوئے دریافت کیا۔

''بس بیٹا وہیں اپنے پڑھنے لکھنے کے کمرے میں'' بابا نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں اسٹڈی روم میں آیا۔ وہ لانگ چیر پر نیم دراز کسی کتاب کے مطالعہ میں غرق تھے۔ آہٹ پر چونک کر سر اٹھایا۔ '' آؤ برخوردار آنے کی اطلاع تو دیدی ہوتی '' میں سمجھ گیا بابا نے ان کے علم میں لائے بغیر مجھے بلوایا ہے اس لئے فون کا ذکر گول کر گیا۔

''ابو آپ تو کافی کمزور لگ رہے ہیں میرے جانے کے بعد ضرور بد پرہیزی کی ہے'' میں نے ان کے گلے لگ کر کہا۔

''نہیں مائی سن ایسی کوئی بات نہیں میں ٹھیک ٹھاک ہوں تم فریش ہو کر آؤ پھر اکٹھے ناشتہ کریں گے۔''

میں فریش ہو کر نکلا تو خان بابا ناشتہ لگا چکے تھے میں نے ان کے برابر کی کرسی سنبھالی۔

''اور سناؤ برخوردار دارالشفاء کیسا جا رہا ہے؟'' تمہارا تو وہاں خوب دل لگ رہا ہو گا۔ پہاڑی مقامات کا بھی ایک اپنا ہی حسن ہوتا ہے اور پھر اپنا ناصر بھی ساتھ ہے۔''

میں دیر تک وہاں کے حالات بیان کرتا رہا سوچا ان پر اسرار عورتوں کے بارے میں انہیں بتاؤں لیکن پھر خاموش ہو گیا۔

میں نے محسوس کیا اس مرتبہ ابو کے چہرے پر کمزوری کے ساتھ ساتھ ایک جامد سا سناٹا بھی تھا۔ رات کا کھانا ہم نے اکٹھے کھایا۔ کافی پینے کے دوران وہ اِدھر اُدھر کی گفتگو کے دوران اچانک ہی بولے۔

''شہریار تم نے شادی کے بارے میں کیا سوچا'' شادی کس کی شادی ؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

'' بھئی تمہاری اور کس کی کیا اس عمر میں شادی رچاؤں گا۔'' مسکرائے

''یہ آج آپ کو اچانک خیال کیسے آ گیا'' '' بھئی سوچتا ہوں اب تمہاری شادی ہو ہی جانا چاہیے کوئی پسند ہو تو بتاؤ۔''

نہیں پاپا میں نے اب تک کسی کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔''

''تو اب دیکھ لو بیٹا دراصل شادی ایک سماجی مذہبی کارروائی ہی نہیں ہے اور نہ دو جسموں

کے ملاپ کا نام ہے بلکہ یہ دو روحوں کا اتصال ہے اسی لئے کسی کو پسند کرنا گناہ نہیں ہے ورنہ تو شادی شادی نہیں ایک قید مسلسل جبر کی ایک آہنی زنجیر بن جاتی ہے''انہوں نے میرے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

''ابو ایسی بھی کیا جلدی ہے ابھی تو میں ٹھیک سے سیٹ بھی نہیں ہوا ہوں۔

''جلدی ہے بیٹا میں نے تمہارے بچپن سے لے کر آج تک کسی بھی فرض میں کوتاہی نہیں کی اب معلوم نہیں کہاں تک کامیاب رہا سوچتا ہوں جلد سے جلد آخری فرض بھی ادا کرتا چلوں۔''

''کہاں چلوں ابو آج آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں بس آپ خوش رہا کریں میں کچھ نہیں جانتا۔ میں اور آپ ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں میں آپ کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ رات زیادہ ہوگئی ہے اب آپ آرام کیجئے۔''میں شب بخیر کہہ کر پاپا کے کمرے سے نکل آیا۔ میرا رخ لان کی طرف تھا۔ دل پر عجیب بوجھ سا تھا۔ اوائل بہار کا موسم تھا موسمی پھولوں سے لان مہک رہا تھا ٹہلتے ٹہلتے میں لان میں پڑی کین چیئر پر بیٹھ گیا۔ میں ابو کی صحت کی طرف سے فکر مند تھا۔ عمر کے اس دور میں خرابی صحت کے باوجود اتنی بڑی کوٹھی میں تنہا ملازموں کے ساتھ رہنا بذات خود ایک مرض ہے امی کا تو صرف ذکر ہی سنا ہے ان کا انتقال تو میری شیر خوارگی ہی میں ہو گیا تھا۔

نہ کوئی بہن بھائی نہ عزیز رشتہ دار ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا سب کچھ تھے۔ یا پھر چھٹن بابا کی ذات تھی چھٹن بابا دادا مرحوم کے منشی فضل خاں کے بیٹے تھے زمینوں کے جھگڑے میں فضل خاں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ چھٹن بابا اس وقت بارہ تیرہ سال کے رہے ہوں گے دادا نے ان کی پرورش کی پڑھایا لکھایا اسے پاس رکھا پھر وہ نئے منشی ہو گئے۔ انہیں دنوں دادی کا انتقال ہوا پاپا کی عمر چار سال رہی ہوگی۔ چھٹن بابا نے بھر پور توجہ سے پاپا کی پرورش میں حصہ لیا۔ دادا جان دماغی امراض کے جانے مانے ڈاکٹر تھے۔ مریضوں کے علاوہ چند ایک دوسرے مشغلے بھی تھے ایسے میں ان کے لئے اکلوتے بیٹے کے واسطے وقت نہیں تھا لیکن کم عمر چھٹن بابا نے اپنے آپ کو ان کے لئے وقف کر دیا۔ ان کی ہر جا و بیجا ضد پوری کرنا بابا کا ایمان تھا۔ اسی طرح جب میری امی بھی ایک سال کا چھوڑ کر دنیا سے چلی گئیں تب میرا بچپن بھی انہیں کی شفیق گود میں گزرا۔ یہ ساری سرگزشت

ابو نے مجھے بتائی تھی۔ اور ہمیشہ ان کے ادب احترام کی تاکید کی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے میں سوچ کی وادی میں اترا ہوا تھا۔

''بیٹے سفر سے تھکے ماندے آئے ہو سردی بھی بڑھ گئی ہے جاؤ جا کر سو رہو۔''

چھٹن بابا کی آواز سے میں نے چونک کر سر اُٹھایا۔ ''بیٹھو بابا'' برابر والی کرسی پر بیٹھے ہوئے بابا نے کہا'' کیا سوچ رہے ہو بیٹا؟''

''بابا میں ابو کی طرف سے بہت پریشان ہوں ان کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب لگ رہی ہے۔ وہ تو اپنی طرف سے ہمیشہ بے پروار ہے لیکن شاید آپ نے توجہ دینا کم کر دی'' میں نے شاکی لہجہ میں کہا۔

''نہیں بیٹا ایسے مت کہو تم اچھی طرح جانتے ہو میرا اس دنیا میں تم دونوں کے سوا کون ہے اگر کوئی بھائی یا بیٹا ہوتا تو وہ محبت اور عزت نہیں دیتا جو آفاق میاں اور تم نے دی ہے۔ خدا تم دونوں کو رہتی دنیا تک قائم رکھے میں تو خود ان کی طرف سے پریشان ہوں تبھی تو ان سے بغیر کہے تمہیں بلوایا۔'' بابا نے گمبیھر لہجہ میں کہا۔

''بابا میرا یہ مطلب نہیں تھا معاف کر دیجئے'' میرا لہجہ شرمندگی سے پُر تھا۔

''میں خود تم سے کہنے والا تھا بہت دنوں سے ان کی عادتوں میں بدلاؤ دیکھ رہا ہوں۔ بیٹا شاید وہ اکیلے پن سے گھبرا گئے ہیں۔ بیٹا یا تو تم اپنی بدلی یہیں کروالوں یا پھر ان کو ساتھ لے جاؤ۔ بہت بار انہیں ٹھنڈی سانسیں بھرتے اور دو ایک بار روتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے''۔

''کیا؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ابو کو روتے دیکھا۔ بھلا انہیں کیا پریشانی ہے؟ دولت، شہرت، عالی شان کوٹھی، زمین جائداد، نوکر چاکر، اسٹیٹس عزت شہرت سبھی کچھ تو حاصل ہے۔ میری شکل میں سعادت منداولاد جس کے پاس اس قدر نعمتیں ہوں اس کے اداس رہنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔

''بیٹا میں بہت زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں یہ سب کچھ نہیں جانتا بس جو کچھ میری بوڑھی آنکھیں دیکھتی ہیں اس سے یہی لگتا ہے وہ بہت پریشان ہیں'' بابا نے بھرے گلے سے کہا۔

''بابا ایک بات کہوں آپ کی بات تو ابو بہت مانتے ہیں امی کے بعد آپ نے ان کو

دوسری شادی کا مشورہ کیوں نہیں دیا۔ ابو شادی کر لیتے ان کے بچے ہوتے آج وہ اس طرح تنہائی کا شکار تو نہ ہوتے۔"

"ارے بیٹا یہ تم نے کیا بات چھیڑ دی" "کیوں اس میں کیا برائی تھی آج کتنی رونق ہوتی"۔

"بس کرو بیٹا ان کے نصیب میں سدا سے اکیلا پن تھا بچپن میں ماں چل بسیں باپ اللہ مرحوم کو بخشے کبھی پلٹ کے خبر نہ لی۔ روپیہ پیسہ سب کچھ تھا لیکن بیٹا بچہ تو اپنوں کی محبت کا بھوکا ہوتا ہے۔ تمہارے دادا جان نے تو ہمیشہ اپنی ہی منوائی۔ ان کے آگے کسی کو دم مارنے کی ہمت ہی نہیں تھی" بابا نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

تو کیا دادا جان ابو سے محبت نہیں کرتے تھے آخر وہ ان کے اکلوتے بیٹے تھے جس طرح میں۔ ابو نے تو مجھے اس طرح ٹوٹ کر چاہا کہ کسی تشنگی کا احساس تک نہیں ہوا" میں نہ معلوم کس بات کی کھوج لگانا چاہتا تھا۔

"چھوڑوں بیٹا ان باتوں کو بس اتنا جان لو تمہارا باپ بد نصیب انسان ہے وہ سدا کا دکھی ہے بہت خیال رکھا کرو۔ چلو اٹھو رات بہت گزر گئی ہے جا کر سو رہو۔" بابا نے اٹھا کر ہی دم لیا۔ میں اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ ابو کے بیڈ روم کی لائٹ آف تھی وہ غالباً سو گئے تھے۔ آرام دہ بستر پر لیٹ کر بھی نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ مجھے لگا بابا بہت کچھ جانتے ہیں کوئی ایسا راز جس کا تعلق ابو سے ہو لیکن بتانا نہیں چاہتے۔ آخر بابا کی عمر اس گھر میں گزری ہے۔ ان سے زیادہ کون جانتا ہو گا ابو کے معتمد خاص کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سوچتے سوچتے آخر مجھے نیند نے آ ہی لیا۔

وہ ملگجی صبح تھی۔ ابو کے خاص ملازم ظفر کی ہذیانی چیخوں نے مجھے بیدار کیا۔ وہ میرے بیڈ کے برابر کھڑا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں وحشت زدہ ہو کر بیڈ سے نیچے اترا۔ بڑے صاحب" بمشکل اس کے منہ سے نکلا۔

"کیا ہوا ابو کو؟" میں بیڈ ٹی لے کر گیا ہزاروں آوازیں دیں ہلایا جلایا پر صاحب بولے ہی نہیں" وہ بمشکل کہہ پایا۔ دو جستوں میں میں نے کمرے کا درمیانی فاصلہ طے کیا۔ سر سے پیر تک

چادر اوڑھے وہ بے سدھ تھے۔ دھڑکن برائے نام نبض مدہم تھی چہرے پر کرب کے شدید آثار۔

آناً فاناً گھر کے تمام ملازم بدحواس ہو کر وہیں جمع ہو گئے، بابا بھی آموجود ہوئے ''بیٹا جلدی کرو میرے آفاق میاں کو بچالو۔''

''بابا اللہ سے دعا کیجئے'' میری کیفیت کا اندازہ تو شاید وہی لگا سکتا تھا جو خود اس درد سے گزرا ہو۔ پھر بھی بوڑھے بابا کی دلجوئی کرنا میرا فرض تھا۔

ملازمین کی مدد سے میں نے ابو کو گاڑی کی سیٹ پر لٹا کر آندھی طوفان کی رفتار سے ہاسپٹل کا رخ کیا۔ وہ اس ہاسپٹل کے جانے مانے ڈاکٹر تھے۔ ہر طرف ہل چل مچ گئی ڈیوٹی پر موجود اسٹاف نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ I.C.U. میں میڈیکل ایڈ شروع ہو گئی۔ پاپا کے کولیگ ڈاکٹر رضوی نے بتایا'' آفاق کو برین ہیمرج ہوا ہے بہتر گھنٹے اگر خیریت سے گزر گئے تو وہ زندگی کی طرف لوٹ آئیں گے۔''

کہنے کو میں بھی ایک ڈاکٹر تھا لیکن عزیز از جاں باپ کے لئے بجز ہاتھ ملنے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کاریڈور کے ایک گوشے میں بابا جائے نماز بچھائے مالک حقیقی کے سامنے گڑگڑا رہے تھے۔ اچانک گلاس ڈور کھول کر ڈاکٹر رضوی تیز قدموں سے میرے قریب آئے اور میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''بیٹا ہم ہار گئے۔ آفاق ہمیں چھوڑ کر چلے گئے''

اتنا سنتے ہی میرا دل مانو رک جائے گا۔ جی چاہتا ہر چیز کو تہس نہس کر دوں دیواروں سے سر ٹکرا کر اپنے کو ختم کو لوں۔ بابا نے قریب آ کر مجھے خود سے لگا لیا اور ان کا پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ''بیٹا صبر کرو جب تم ہی حوصلہ ہارو گے تو مجھ بوڑھے کا کیا ہوگا۔ ہمت سے کام لو چلو انہیں لے کر گھر چلتے ہیں۔''

ایمبولینس کے ذریعہ جسد خاکی کو رہائش گاہ لایا گیا۔ ابدی سفر کی تیاریاں شروع ہوئیں دیکھتے دیکھتے منوں مٹی کے نیچے آخری آرامگاہ میں سلا دیا گیا۔ ابدی نیند، قیامت تک نہ ٹوٹنے والی نیند۔

چٹ کی آواز کے ساتھ کیمرہ روشن ہو گیا۔ ناصر میرے بیڈ کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر ایک بار پھر میرے احساسات بیدار ہو گئے۔ گزرے واقعات ذہن کے دریچوں سے

باہر آنے لگے۔

''شہر یار میرے دوست مرد ہو حالات کا مقابلہ کرو۔ مشیت ایزدی میں کوئی چارہ نہیں۔ قانونِ قدرت میں بھلا کون دخل دے سکتا ہے'' ناصر نے میرے شانوی پر دونوں ہاتھ رکھ کر دلاسہ دیا۔

''میرے دوست لگتا ہے سب کچھ ختم ہو گیا جینے کی امنگ ختم ہو گئی۔ حواسوں نے اس طرح ساتھ چھوڑ دیا کہ تمہیں بھی فون نہ کر سکا۔''

''مجھے بابا نے فون کیا تھا لیکن میں چچا جان کا آخری دیدار نہ کر سکا۔ اتفاق سے ٹرین لیٹ تھی بابا نے بتایا تم نے اپنے کو کمرے تک محدود کر لیا ہے دو روز ہو گئے کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ میرے دوست ایسا کر کے تم چچا جان کی روح کو تکلیف دینے کا باعث بن رہے ہو۔ وہ تمہیں ادنیٰ سی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔''

ناصر کی تسلیاں اور بابا کی شفقت نے میرے غم کی شدت کو کسی حد تک کم کر دیا لیکن مجھے اپنا وجود دکھوکھلا محسوس ہوتا تھا۔ ناصر ہمہ وقت میرے ساتھ ہوتا۔ سچ ہے مخلص دوست بھی خدا تعالیٰ کی رحمت ہوتا ہے میں تو عزیز رشتہ داروں سے ویسے بھی خالی تھا۔ شعور کی منزل میں آتے ہی ابو یا پھر خان بابا کو دیکھا ناصر بچپن کا ساتھی جوانی کا دمساز ہمارا بچپن ایک ساتھ گزرا۔ اسکول پھر کالج اور آج دونوں ایک ہی پیشہ سے منسلک تھے۔

آج ابو کو گزرے چار روز ہو گئے۔ اچانک مجھے اس رات والی بابا کی گفتگو یاد آ گئی خان بابا ان کے بارے میں کیا بتانا چاہتے تھے ضرور کوئی ایسا راز جس سے وہ آگاہ ہیں۔ میں نے ناصر کو ساری بات بتائی کیونکہ اس کی میری دوستی من تو شدم تو من شدی والی تھی۔

''ہمیں بابا سے ضرور معلوم کرنا چاہیے ہو سکتا ہے کوئی ادھورا کام ادھورا خواب جو وہ زندگی میں پورا کرنا چاہتے ہوں'' ناصر نے مشورہ دیا۔

ہم دونوں بابا کے کمرے میں گئے وہ نماز سے فارغ ہو کر فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بابا انسان نہیں رحمت کا ایسا فرشتہ معلوم ہو رہے تھے جو آسمانی تحفہ کے طور پر دنیا میں اتار گیا ہو۔

"کیا بات ہے بچو؟ کوئی کام تھا تو مجھے بلوالیا ہوتا" بابا نے فاتحہ کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔کام کچھ نہیں تھا بابا ہم دونوں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا "کہو کیا بات ہے؟"

"بابا اس رات آپ نے کہا تھا تمہارا باپ بہت بدنصیب ہے ہمیشہ سے دکھی۔ان کے دکھوں کی کیا وجہ تھی۔" "میں نے ایسا کہا تھا؟" انہوں نے انجان بن کر کہا۔ میں سمجھ گیا وہ کچھ بھی بتانے سے گریزاں ہیں۔

"بابا آپ کو بتانا پڑے گا وہ کون سا دکھ اور بدنصیبی تھی جوان کے ساتھ ہی دفن ہوگئی۔ میں ان کا بیٹا ہو کر یہ بھی معلوم نہ کر سکا کہ میرا باپ کس کرب میں مبتلا رہا۔ مجھے خود سے شرمندگی ہوتی ہے۔" آخری الفاظ کہتے کہتے میری آواز بھرا گئی۔

"نہیں بیٹا ایسا نہیں کہتے تم ان کی زندگی کی اکلوتی خوشی، ان کا مان ان کا غرور تھے۔ میں نے کئی بار کہا سب کچھ اپنے بچے سے کہہ دو شاید وہی کچھ کر سکے وہ ہی تلاش لے۔" بابا نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "کس کو بابا کس کو" میری بے چینی حد سے سوا ہوگئی۔

"ان کی بیوی کو ان کی کھوئی ہوئی بچی کو" کیا؟ مجھے اپنی سماعت اور بابا کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا۔

"بابا شہریار کی ماں تو اس کو ایک سال کا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں یہ سب آخر کیا ہے" آپ کیا کہہ رہے ہیں" ناصر نے بابا کو شانوں سے تھام کر سوال کیا۔" بیٹے اگر تم دونوں اس راز سے جاننے کے درپہ ہی ہو تو سنو دل تھام کر سنو۔

....

فاروق احمد خاں جاگیردار ہونے کے ساتھ ساتھ دماغی امراض کے مشہور ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر ضرور تھے لیکن ان کی نس نس میں جاگیردارانہ خون گردش کر رہا تھا۔صرف ایک بیوہ بہن تھیں انہوں نے ایک سیدھی سادی خوبصورت لڑکی دیکھ کر جلدی ان کی شادی کر دی۔

بیرونی شوق ختم تو نہیں ہوئے البتہ کمی ضرور آ گئی۔ خاموش طبع صابر و شاکر بیوی نے ان کو ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد رکھا۔ جلد ہی ان کا آنگن ایک معصوم کلکاریوں سے گونج اٹھا۔

بعض بچے منہ میں سونے کا چمچ لے کر دنیا میں آتے ہیں اور آفاق بھی انہیں میں سے ایک تھا۔ وہ اگر دن کو رات کہتا تو چاہنے والے سورج پر کالی چادر ڈالنے کا سوچنے لگتے۔ ابھی زندگی کی چار بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ ممتا کی چھاؤں سر سے ہٹ گئی۔ ایک رات بیگم صاحبہ ایسی سوئیں کہ دوبارہ جاگنا نصیب نہیں ہوا۔ پھوپی کی پر شفقت گود وا ہوئی اور ننھے آفاق اس میں سما گئے پتہ بھی نہ چلا کہ وہ کتنے بڑے نقصان سے دو چار ہو چکے ہیں۔

شفیق بہن سے بھائی کی تنہا زندگی زیادہ دنوں تک برداشت نہیں ہوئی انہوں نے سوچا اجڑے گھر میں پھر سے بہار آ جائے۔ وہ بھائی سے بات کرنے کا موقع تلاش کرنے لگیں۔ جلد ہی یہ موقع میسر آ گیا۔

''بھیا میں چاہتی ہوں تم شادی کر لو اگر تمہاری مرضی ہو تو رفیق بھائی کی لڑکی سے بات چلاؤں۔'' انہوں نے بھائی کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آپا در اصل میں بھی کئی روز سے آپ سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا بس ذرا ہمت نہیں ہوئی''

''کیو ایسی کیا بات ہے جس میں ہمت کی ضرورت ہے'' وہ سمجھ گئیں ضرور بھائی نے کوئی لڑکی پسند کر لی ہے وہ وہ بات یہ ہے کہ فاروق خاں ہکلا کر خاموش ہو گئے۔

''صاف بات کرو کیا کہنا چاہتے ہو''

''آپا میں نے ایک مصیبت کی ماری سے خاموشی سے نکاح کر لیا ہے ایک دھماکا ہوا'' لو بھلا نکاح بیاہ بھی چھپ کر ہوتے ہیں۔ کون ہے وہ لڑکی؟ کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں تھا۔'' ان کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔

ایسی کوئی بات نہیں ہے ناز مصیبت کی ماری زمانے کی ستائی ہوئی ہے۔ پہلے شوہر نے ظلم کی انتہا کر دی۔ طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ ساتھ میں ایک معصوم بچی بھی ہے میں نے کار ثواب سمجھ کر اپنی پناہ میں لے لیا۔ فاروق خاں نے اپنی کارکردگی بتائی۔

''تم نے کہاں رکھا ہے'' کچھ دیر شاکد رہ کر انہوں نے پوچھا۔

''وہ فارم والی نہر کے برابر سفید کوٹھی میں ہے''

''فاروق خاں چلے گئے اور آپا گم سم وہیں بیٹھی رہیں کچھ دیر بعد انہوں نے ملازم کو آواز

دے کر چھٹن کو بلانے کا کہا۔ چھٹن تم نے اس گھر کے لئے جو کچھ کیا وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے ہم تمہاری وفاداریوں کا بدلہ نہیں چکا سکتے۔

''نہیں آپا ایسا نہ کہئے میری جان بھی اگر آپ سب کے کام آ جائے تو اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ سنو ہمارے بھائی نے ہماری مرضی کے خلاف ایک مطلقہ سے نکاح کر لیا ہے ایک دو سالہ بچی بھی اس کے ہمراہ ہے۔ وہ ابا جان کی نہر والی سفید کوٹھی میں ہے۔ بیوہ یا مطلقہ سے نکاح ہماری نظر میں برا فعل نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو عین ثواب ہے لیکن دال میں کہیں کالا ضرور ہے ورنہ اتنی راز داری کی ضرورت کیا تھی۔ ہم نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئیں۔

''میرے لئے کیا حکم ہے'' ان کی طویل خاموشی کو توڑنے کے لئے چھٹن نے کہا۔

''تم نہایت خاموشی اور احتیاط سے اس عورت کے تمام کوائف اور چال چلن کے بارے میں معلومات اکٹھی کرو لیکن اس کی بھنک بھی فاروق کو نہیں ملنا چاہیے۔ مجھے تمہارے علاوہ کسی اور پر بھروسہ نہیں ہے۔'' ''ذرہ نوازی ہے آپ کی بھلا میں کسی قابل ہوں آپ بے فکر رہئے کسی کو کچھ معلوم نہ ہو گا۔''

چھٹن کی تگ و دو کا نتیجہ سامنے آیا وہ یہ تھا۔ ناز ایک بد کردار عورت تھی۔ ایک شریف انسان نے نکاح کر کے گھر کی زینت بنانا چاہا لیکن اس کے تعلقات متعدد مردوں سے تھے۔ وہ دولت کی رسیا تھی طلاق بھی جبریہ لی گئی۔ اب اس کے نشانے پہ فاروق صاحب تھے۔ ساتھ میں ایک بد چلن بھائی بھی تھا۔ فاروق خاں کی بہن سب کچھ سن کر ساکت رہ گئیں۔ فاروق خاں نے ناز کو یہاں لانے کا تذکرہ کیا۔ لیکن انہوں نے صاف الفاظ میں کہہ دیا'' بھائی تم اپنی زندگی کے مختار ہو۔ وہ کہیں اور نہیں والد صاحب کی ہی کوٹھی میں رہ رہی ہے بہتر ہے اسے وہیں رکھو۔''

بہن کے تیور دیکھ کر فاروق خاں خاموش ہو گئے۔ بڑی بہن ماں کی جگہ تھیں۔ احترام مانع تھا۔ وقت کچھ اور آگے بڑھا کل کا معصوم بچہ شباب کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا اس کی نیچر باپ سے یکسر الٹ تھی نہ دوست احباب، نہ خوشامدی نہ دیگر جاگیردارانہ شوق۔ باپ کی بے حسی و بے رخی نے اس کو حساس بنا دیا تھا گرچہ فاروق خاں روزانہ ایک آدھ چکر ضرور لگاتے لیکن باپ بیٹے کے درمیان اجنبیت کی ایک ایسی خلیج تھی جس کا پاٹنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

پھر ایک روز ماں کی جگہ پر کرنے والی ممتا کی دیوی شفیق پھوپی نے بھی چپکے سے آنکھیں بند کر لیں۔ آفاق دھاڑیں مار مار کر روئے۔ فاروق خاں مع بیوی اور اوباش سالے کے آئے آنہوں اور سسکیوں کے درمیان مرحومہ کو آخری آرامگاہ تک پہنچا دیا گیا۔

نازکی دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔ یہ عالی شان محل نما کوٹھی اس کا خواب تھی۔ وہ ہمیشہ چشم تصویر میں اپنے کو اس میں چلتا پھرتا دیکھتی تھی۔ وہ خوش تھی اس کی راہ کا ایک کانٹا تھا۔ وقتی طور پر وہ اس گھر کی مالکہ ضرور بن گئی تھی لیکن آفاق ہی فاروق خاں کے اصل وارث اور تمام املاک کے مالک تھے۔ وفادار چھٹن سب کچھ دیکھ اور سمجھ رہے تھے۔ وہ سایہ کی طرح آفاق کے ساتھ لگے رہتے لیکن آخر ایسا کب تک چلتا۔ چھٹن کے مشورے سے آفاق ہوسٹل میں رہنے لگے لیکن دونوں ہی اس بات سے بے خبر تھے کہ اس عورت کا سازشی ذہن آفاق کے گرد کون سا جال بن رہا ہے۔ پہلے شوہر کی بیٹی جوان ہو چکی تھی۔ رنگ ڈھنگ میں ماں سے دو ہاتھ آگے تھی۔ گھومنا پھرنا شاپنگ، کلب، لڑکوں سے دوستی خدا ہی جانے کون کون سے شوق پالے ہوئے تھی۔

اگر آفاق کی شادی میری ثمینہ سے ہو جائے تو سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی سلامت۔'' اس نے فاروق خاں پر زور ڈالنا شروع کیا۔ وہ بول بندہ کس کا۔ کہ مصداق تھے۔

آفاق اپنی تعطیلات پُر فضا ہل اسٹیشن پر گزارتے تھے۔ ایسے میں چھٹن کے مزے ہوتے۔ ان کے کلاس فیلوز ہنستے چھٹن کو ان کے .P.A اور باڈی گارڈ کہہ کہہ کر پکارتے۔

اس مرتبہ وہ روپ نگر جا رہے تھے۔ یہ اپنے نام ہی کی طرح ایک خوبصورت پہاڑی مقام تھا۔ اسی روپ نگر میں وہ حسین حادثہ ہوا جس نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ حسن سے مرعوب نہ ہونے والا ایک سنجیدہ اور باوقار نوجوان ایک پہاڑی دوشیزہ کے لئے پاگل ہوا تھا۔ آفاق کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی ایک ساتھ جینے مرنے کے پیمانے باندھے گئے۔ مستقبل کے حسین تانے بانے بنے گئے لڑکی نے بتایا دنیا میں صرف اس کی ماں اور ایک شادی شدہ بہن ہے۔

تعطیلات ختم ہوئیں آفاق اپنی محبت کے حسین ہاتھوں میں انتظار کے جگنو اور آنکھوں میں وعدوں کی قندیلیں روشن کر کے واپس ہوئے۔

''چھٹن تم جاتے ہی ابا جان کو سب کچھ بتا دینا۔ جانتے ہو میری آنکھوں کا یہ پہلا

خواب ہے میں اسے تعبیر ضرور دوں گا۔ میں نے اس کی ماں سے سب کچھ طے کر لیا ہے۔ وہ بیمار ہیں اور جلد سے جلد اس کی شادی کرنا چاہتی ہیں ایسا نہ ہو دیر ہونے پر وہ مشرقی روایت کی بھینٹ چڑھ جائے۔"

گھر پہنچ کر ساری باتیں فاروق خاں کے گوش گزار دی گئیں۔ لیکن ان کا ریموٹ کنٹرول جس ہستی کے ہاتھ میں تھا وہ کیسے یہ سب گوارہ کر لیتی۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ مایوس ہو کر آفاق نے خود باپ سے التجا کی۔ اس نے پہلی بار باپ سے کچھ مانگا تھا۔ لیکن بدلے میں کیا ملا؟

"گھر میں لڑکی ہوتے ہوئے باہر دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اور پھر ایک اجڈ گنوارن پہاڑی لڑکی ہرگز نہیں" وہ غرائے۔

"ابا جان میں ثمینہ سے مر کر بھی شادی نہیں کر سکتا وہ پہاڑی لڑکی اجڈ گنوار نہیں اچھے خاندان کی پڑھی لکھی ہے" آفاق اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔

"تمہاری آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ بہر حال ہم تمہارے باپ ہیں دشمن نہیں وہی کریں گی جو تمہارے حق میں بہتر سمجھیں گے۔" فاروق خاں نے لہجہ کو نرم کر کے سمجھانے کا انداز اختیار کیا۔

آفاق شکستہ دل سے واپس لوٹ گئے۔ دو ہفتے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ ایک صبح آفاق عجلت سے آئے چھٹن کو ساتھ لیا اور گاڑی کو روپ نگر جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔ راستے میں انہوں نے چھٹن کو بتایا "مجھے کل اس کا خط ملا ہے ماں بہت بیمار ہے وہ اس کا نکاح جلد سے جلد کرنا چاہتی ہیں اگر میں نہیں پہنچا تو وہ کسی پہاڑی سے گر کر ختم ہو جائے گی۔"

آفاق نے روپ نگر پہنچ کر بڑی بی کو اپنے خاندانی کوائف، باپ کا انکار سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ ان کی تجرباتی آنکھوں نے نوجوان کے چہرے پر برستی شرافت اور اس کے بیان کی صداقت کو پرکھ لیا۔

"بیٹا میرے پاس دو بیٹیوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ تم اس بے سہارا لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر راستے میں چھوڑ نہ دینا ورنہ یہ کہیں کی نہ رہے گی۔" بوڑھی عورت کا لہجہ ملتجیانہ تھا۔

"اماں جی آپ خدا پر اور اس کے بعد مجھ پر بھروسہ رکھئے موت کے علاوہ ہمیں کوئی جدا

نہیں کر سکتا۔'' آفاق نے بڑی بی کے ہاتھ تھام کر کہا۔

دو دن کے اندر ہی چار چھ لوگوں کی موجودگی میں دونوں نکاح کے مقدس بندھن میں بندھ گئے۔ آفاق کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ دولت کی کمی نہیں تھی فاروق خاں کے علاوہ ان کی پھوپی صاحب ثروت تھیں اور مرنے سے پہلے تمام املاک کے علاوہ لاکھوں کا بینک بیلنس آفاق کے نام کر گئی تھیں۔

اپنی محبوب شریک حیات کو قیمتی زیورات وملبوسات سے آراستہ کر کے ایک کرائے کے عمدہ فلیٹ میں سیٹ کر دیا اور جلدی آنے کا وعدہ کر کے لوٹ آئے۔

وقت اپنی مقررہ ڈگر پر چلتا رہا دیکھتے دیکھتے ایک سال بیت گیا اب وہ بحیثیت ڈاکٹر ہاسپٹل میں خدمات انجام دے رہے تھے۔

وہ ایک روشن صبح انہوں نے چھٹن کو خوش خبری سنائی وہ ایک پیارے سے بیٹے کے باپ بن گئے۔ ناز ساری باتوں سے بے خبر اپنے تخیلاتی محل کھڑے کر رہی تھی۔ ناز کے زور دینے پر فاروق علی خاں نے آفاق سے اصرار کیا کہ وہ ثمینہ سے شادی کر لیں۔ جواب میں انہوں نے جو کچھ سنا وہ سب ناز پر بجلی بن کر گرا۔ چشم زدن میں اکے تخیلاتی محل زمین بوس ہو گئے۔ لیکن وہ پسپا ہونے والوں میں نہیں تھی۔ ہاری ہوئی بازی جیتنا جانتی تھی۔ اس کے شاطر ذہن نے ایک خوفناک پروگرام ترتیب دیا اور پینترا بدل کر میدان میں آ گئی۔

''آپ ناراض نہ ہوں یہ تو خوشی کا مقام ہے ہمارے برسوں کی آرزو پوری ہوئی۔ اس گھر کے اکلوتی وارث نے ہمیں خوشیوں سے ہمکنار کر دیا۔ بس زرا سا دکھ ضرور ہے آفاق میاں نے ہمیں اپنا نہیں سمجھا۔ ہم دھوم دھام سے دولہا بنا کر اس بچی کو لے کر آتے۔ خیر کوئی بات نہیں میں خود جاؤں گی دلہن اور اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو لے کر آؤں گی۔'' فاروق علی خان نے حیرت سے بیوی کو دیکھا اور سوچا ناز کا دل کس قدر وسیع ہے سیدھے سادھے آفاق بھی دل میں شرمندہ تھے انہوں نے کتنا غلط سمجھا تھا۔ اس عورت کا دل تو سمندر جیسا وسیع ہے۔

لیکن زمانہ ساز چھٹن کھٹک گئے وہ اچھی طرح جانتے تھے جس طرح سانپ سو سال میں بھی اپنی فطرت نہیں بدل سکتا اسی طرح رشک حسد ولالچ کی ماری ہوئی بدکار عورت نہیں بدل سکتی۔

عورت ممتا کا سرچشمہ ضرور ہے لیکن جب ناگن کے روپ میں آ کر اپنا تقدس کھو بیٹھتی ہے تب اس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ انسانی تاریخ ایسی عورتوں کی تاریخ سے پُر ہے۔

آفاق پوری طرح اس زہریلی ناگن کے زیر اثر آ چکے تھے۔

دوسرے ہی روز ناز آفاق کے بیوی بچے کو شان سے گھر لے آئی۔ رونمائی میں اپنے قیمتی کنگن پہنائے بچے کے واری صدقے آفاق بھرپور طریقے سے مطمئن ہو گئے۔ ایسے میں چھٹن کی کون سنتا انہوں نے بھی اپنے لب سی لئے۔ چند دن خوشیوں کے جھولے جھولتے گزرے۔ معصوم بچے کی کلکاریوں سے کوٹھی کی سونی دیواریں گونج اٹھیں۔ دلہن کا پیر پھر بھاری تھا۔ آفاق خوشی سے جھوم اُٹھے۔

اچانک فاروق علی خاں پر بیماری کا حملہ ہوا۔ آفاق تندہی سے باپ کے علاج میں مصروف تھے کہ عثمان آباد اور لاتور میں زبردست زلزلہ آیا۔ ہزاروں ہنستے بستے گھر اجڑ گئے ہر طرف ہاہا کار مچ گئی۔ ملک کے ہر حصے سے امدادی پارٹیاں روانہ ہو گئیں۔ آفاق بھی ڈاکٹروں کے ایک وفد کے ساتھ اپنی خدمات دینے چلے گئے۔

دوسرے روز بیگم ناز نے چھٹن کو بلایا۔ ''میری خالہ گڑھی میں رہتی ہیں کل ہی ان کا خط آیا ہے وہ مجھ سے ملنے کو بے چین ہیں بہتر ہے تم آج گڑھی کے لئے روانہ ہو جاؤ۔ کل شام تک انہیں لے کر واپس آ جانا'' ناز نے چند بڑے نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

''بیگم بڑے صاحب کی طبیعت بھی خراب ہے اور آفاق میاں بھی گئے ہوئے ہیں بہتر ہے ان کی آمد تک رک جائیں'' چھٹن نے حلیمی جواب دیا۔

''اوہ ہو کیا تمہارے علاوہ یہاں کوئی نہیں ہے لگتا ہے پوری کوٹھی تمہارے کندھوں پر رکھی ہوئی ہے سب بڑھ کر میں ہوں اور ملازموں کی فوج تمہیں نظر نہیں آ رہی ہے۔''

چھٹن کے انکار نے ناز کو چراغ پا کر دیا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق چھٹن گڑھی روانہ ہو گئے۔ دن ڈھلا آفاق کی خوشیوں کی طرح رات نے کائنات پر اپنا سیاہ آنچل ڈال دیا۔ رات ایک بدنصیب کے مقدر کی طرح تاریک تھی۔ غالباً چاند ۲۷ تاریخ کا ماندہ چاند دنیا کو منور کرتے کرتے تھک ہار کر اپنے حجرے میں آرام کر رہا تھا۔ ایک ناگن عورت کا روپ دھار کر ایک معصوم عورت

کوڈسنے جارہی تھی۔ ناز نے دراز سے ریوالور نکالا اور دبے پاؤں آفاق کے بیڈروم کی طرف بڑھی۔ آنے والی تباہی سے بے خبر ایک ماں لوری گا کر معصوم بچے کو سلانے میں مگن تھی۔ ناز نے اندر داخل ہو کر اپنے پیچھے دروازہ بند کیا۔ اور ہاتھ بڑھا کر بچے کو ماں کی گود سے چھین لیا۔

''امی........امی کیا بات ہے'' اس نے اپنی بڑی بڑی حیران آنکھیں اٹھائیں۔

''کون امی؟ کس کی امی؟ ڈائن تو کیا سمجھتی تھی آفاق کو میری ثمینہ سے چھین لے گی اور میں خاموش دیکھتی رہوں گی یہ صرف تیرا خواب تھا میری بچی محرومی کے احساس کے ساتھ زندہ رہے اور تو اس کے حصے کی خوشیاں دونوں ہاتھوں سے بٹورے۔'' ناز نے گرج کر کہا۔

''امی مجھ سے کیا خطا ہوگئی۔'' تھرتھر کانپتے ہوئے آفاق کی بیوی نے کہا۔

''ابھی سب کچھ تیری سمجھ میں آجائے گا سن تجھے اپنا شوہر اور بیٹا کتنے عزیز ہیں اور تو ان کے لئے کیا کر سکتی ہے؟'' ناز کی سنگدلی انتہاؤں پر تھی۔

''میں ان کے لئے سب کچھ کر سکتی ہوں اپنی جان بھی دونوں پر قربان کر سکتی ہوں'' اٹک اٹک کر جملہ ادا ہوا۔

تیری جان سے مجھے کوئی سروکار نہیں یہ لے قلم اور کاغذ ابھی اسی وقت آفاق کے نام ایک خط لکھ'' لکھ مجھے تم سے کبھی محبت نہیں تھی۔ دولت کے لالچ میں میں نے تم سے ڈھونگ رچایا تھا۔ ورنہ جس سے مجھے سچا پیار ہے وہ آج بھی میرا منتظر ہے۔ میں اس کے پاس جارہی ہوں۔''

''نہیں آپ کو ثمینہ کی قسم ایسا ظلم مت کیجئے۔'' میں آپ کے پیر پکڑتی ہوں کہہ کر وہ سنگدل عورت کے پیروں میں جھک گئی۔''

''پیچھے ہٹ، ناز نے الگ ہوتے ہوئے کہا۔'' امی آپ کو خدا کا واسطہ'' بے کسی کی زندہ تصویر سے آواز آئی۔ اچانک ناز نے گریبان سے ریوالور نکال کر بچے کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ ''لکھتی ہے یا اس کو ابھی ٹھنڈا کر دوں۔'' ممتا تڑپ اٹھی ''نہیں نہیں اس کو مت ماریئے جو آپ کہیں گی میں کرنے کو تیار ہوں''

''اب تو رات کے اندھیرے میں کہیں دور چلی جاؤ ہاں جہاں آفاق تیری پرچھائیوں کو بھی نہ پاسکے۔'' ناز نے تحریر لے کر کچھ نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے نوٹ نہیں اپنا بچہ چاہیے اسے مجھے دیدو۔'' اس نے بچے کو لینے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ بچہ، ناز استہزایہ ہنسی، بچہ میرے پاس ضمانت کے طور پر رہے گا اگر کبھی تو نے آفاق سے ملنے یا اس سے کوئی رابطہ کرنے کی کوشش کی تو وہ بچے کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ تیری گمنامی اور بے زبانی ہی اس کی زندگی کی ضمانت ہے۔

ایک بے کس ممتا کی ماری بے قصور ہستی رات کے اندھیروں میں گم ہوگئی۔ اندھیری فضاؤں نے اس کے وجود کو نگل لیا۔ نہ زمین کانپی اور نہ آسمان تھرایا۔ کیونکہ روزِ ازل سے شاید یہی رقم ہو چکا تھا۔ دو پیار بھرے دلوں کے بیچ ابدی جدائی کی فصیل قائم ہوگئی۔

دوسرے روز فاروق خاں کی حالت اچانک بگڑ گئی۔ چھٹن نے گھر واپس آ کر عجب افرا تفری کا ماحول دیکھا۔ گیٹ کے قریب ہی فضلو بچے کو بہلا رہا تھا لیکن وہ بجائے چپ ہونے کے زور زور سے بلک رہا تھا۔

''کیا ہوا فضلو اس کو کیوں رلا رہے ہو بیگم کہاں ہیں؟'' چھٹن نے فضلو کی گود سے بچے کو لیتے ہوئے دریافت کیا۔

''پتہ نہیں جی وہ تو شاید کہیں گئی ہوئی ہیں اور ادھر سرکار کی حالت ٹھیک نہیں ہے ابھی ڈاکٹر دیکھ کر گیا ہے۔'' فضلو کا جواب دینے کا اپنا ہی انداز تھا۔

''بہو کہاں گئیں؟ بڑے صاحب کی حالت خراب بچہ بلکتا ہوا۔'' چھٹن کا ماتھا ٹھنکا۔

ہاسپٹل سے ایڈریس لے کر آفاق کو باپ کی کی تشویشناک حالت کی اطلاع دیدی گئی۔ اِدھر آفاق نے قدم رکھا اُدھر فاروق خاں نے آخری ہچکی لی۔ حشر بر پا تھا ناز بیگم کی چیخیں آسمان کا سینہ شگاف کیئے دے رہی تھیں۔

آفاق اپنے بیڈروم میں آئے بیوی کو نہ پا کر استفسار کیا چھٹن نے جو کچھ ملازم سے سنا تھا بتا دیا اور یہ بھی کہ وہ بیگم صاحبہ کی خالہ کو لانے کڑھی گئے تھے۔ زیادہ تفصیل میں جانے کا نہ وقت تھا نہ موقع۔ فاروق خاں کے آخری سفر کی تکمیل کی تیاریاں کرنا تھیں۔ منتشر ذہن آفاق یہی سوچ سکے کسی ایمرجنسی اطلاع پر بہن سے ملنے گئی ہوگی۔ سوئم کی فاتحہ سے فارغ ہو کر ناز آفاق کے بیڈروم میں آئی۔

''بیٹا تمہاری دلہن چلتے ہوئے یہ خط دے گئی تھیں'' انہوں نے ایک لفافہ آفاق کو دیتے ہوئے کہا۔

''کیا لکھا ہے؟'' انہوں نے لفافہ کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''اللہ جانے بیٹا جلدی سے لفافہ میرے ہاتھ میں تھمایا اور بغیر کچھ کہے چلدیں بلکہ میں نے کہا بھی خسر کی حالت خراب ہے رک کر چلی جانا۔ پر مانتی جب نا۔'' ناز نے مکاری سے کہا۔

خط کا پڑھنا تھا مانو کمرے کی چھت ان پر آ گری ہو۔ الفاظ دھماکہ خیز مادے کی طرح پھٹے اور وہ اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ ایک کوہِ گراں تھا جو چشم زدن میں ان پر آ گرا تھا ان کا وجود ریزہ ریزہ ہو گیا۔ کسی الف لیلیٰ شہزادے کی طرح وہ سنگی بت میں تبدیل ہو گئے۔ صرف سانس کی آمد و رفت زندگی کی دلیل تھی۔

فضلو دودھ کا گلاس لے کر حسب معمول کمرے میں گیا۔

''صاحب کو کیا ہوا؟ ارے صاحب کو کچھ ہو گیا'' کہتا وہ الٹے پیروں واپس ہوا۔ چشم زدن میں وہ تمام لوگ فاروق خاں کے سوم میں شرکت کرنے جمع ہوئے تھے کمرے میں اکٹھا ہو گئے۔

''ارے میرے بیٹے کو کیا ہوا'' ناز سینے پر دوہتڑ مارتی روتی چلاتی کمرے میں داخل ہوئیں۔ ''کیا ہوا آفاق میاں کو؟'' چھٹن سب سے آخر میں داخل ہوئے۔

''مہربانی کر کے آپ سب لوگ باہر جائیں فضلو ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے'' چھٹن اپنی سدھ بدھ کھو چکے تھے۔ ملازموں کی مدد سے انہیں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا گیا۔ چھٹن کے زانوں پر انکا سر تھا۔ ڈرائیور طوفانی رفتار سے ہاسپٹل کی طرف روانہ ہوا۔

اچانک چھٹن کی نظر ان کے ہاتھ میں پکڑے مڑے تڑے کاغذ پر پڑی آہستہ سے انہوں نے کاغذ نکال کر جیب میں رکھ لیا۔ ان کو زبردست نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ دماغ شدید شاک کے زیر اثر تھا۔

ڈاکٹروں کی انتھک کوششیں چھٹن کی بے لوث دعائیں، تقریباً دو ہفتے بعد وہ زندگی کی طرف لوٹ آئے لیکن کس طرح۔ خالی وجود اداس آنکھیں، خشک ہونٹ، احساسات سے عاری، ڈاکٹروں کی رائے تھی کسی گہرے صدمے نے دماغ کو ماؤف کر دیا ہے لیکن یہ وقتی کیفیت ہے رفتہ

رفتہ نارمل ہو جائیں گے۔ دیگر لوگ اس صورت حال کو باپ کی موت کا صدمہ سمجھ رہے تھے اصل حقیقت سے چھٹن کے علاوہ کوئی واقف نہیں تھا وہ اس قاتل تحریر کو پڑھ چکے تھے جس نے آفاق کو اس حالت کو پہنچایا تھا۔

ایک ماہ ہاسپٹل رہ کر وہ گھر لوٹ آئے۔ لیکن کس طرح؟ ایک زندہ لاش، بے شک وہ جی رہے تھے یوں جیسے اپنی ہی لاش کاندھوں پر اٹھائے ہوں۔ انہوں نے کسی سے کوئی گلہ نہیں کیا اور کرتے بھی کس سے؟ قصوروار ان کی دنیا ویران کر کے ہمیشہ کے لئے ان کی زندگی سے دور جا چکی تھی۔ وہ صرف اپنے بیڈ روم تک محدود ہو کر رہ گئے۔

ایسے میں ماں کی ہدایت پر ثمینہ ان کے ارد گرد منڈلاتی رہتی لیکن آفاق کے ہونٹوں پر ایک جامد چپ تھی۔

چھٹن سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ وہ سوچتے ان حالات کے پیچھے ضرور ناز کی کوئی گہری سازش ہے آفاق کے گرد کوئی جال بنا جا رہا ہے۔ ان کی چھٹی حس چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی ایسا نہیں جو نظر آ رہا ہے۔ پسِ پردہ کچھ اور ہی ہے۔ ایسے میں وہ تحریر ان کا منہ چڑاتی نظر آتی۔

یہ عورت زہریلی ناگن سے زیادہ خطرناک ہے خدا معلوم اس نے کس طرح یہ لکھوائی ہو گی۔ دل ہمک ہمک کر جانے والی کی بے گناہی کا یقین دلاتا لیکن وہ ثبوت کہاں سے لاتے۔''

وقت بڑے کاری زخم کا مرہم ہے رفتہ رفتہ آفاق نارمل ہوتے گئے لیکن وہ پہلے آفاق سے یکسر الٹ تھے ظاہر ہے اعتماد کا بت ٹوٹا تھا جس کی کرچیاں روح میں پیوست ہو گئی تھیں۔

ان کا بچہ ماں کی ممتا سے یکسر محروم ہو چکا تھا باپ کی پر شفقت گود بھی کم ہی نصیب ہوتی۔ ایسے میں چھٹن کی گود اس کے لئے ٹھنڈی چھاؤں تھی۔ وہ حتیٰ الامکان اسے ناز سے دور رکھتے۔

وقت کی سوئیاں آگے پیچھے دوڑتی رہیں اور وہ ہو گیا جس کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ قانون قدرت ہے کہ انسان کو اپنے اعمال کا جواب روزِ حشر سے پہلے اس دنیا میں دینا ہوتا ہے۔ اسی کا نام مکافاتِ عمل ہے۔

وقت ہر ظلم تمہارا تمہیں لوٹا دے گا
وقت کے پاس کہاں رحم و کرم ہوتا ہے

اعمال کے جواب دہی کا وقت آچکا تھا۔ایک رات ثمینہ ماں کے سارے زیورات اور نقدی لے کر اپنے چاہنے والے کے ساتھ لاپتہ ہوگئی ناز کو اس کے کمرے سے خط ملا۔

جب آپ کو معلوم ہوگا میں آپ سے بہت دور جا چکی ہوں گی میں کب تک آپ کے کہنے سے اس پتھر سے سر پھوڑتی رہتی۔ عاصم مجھ سے محبت کرتا ہے میں اس کے ساتھ جا رہی ہوں۔ اگر مجھے ایک فیصدی بھی یقین ہوتا کہ آفاق جیسے پتھر میں جونک لگ سکتی ہے تو میں خود ایسا قدم نہیں اُٹھاتی اس کمبخت کے چکر میں میں اپنے سنہری دن رات برباد نہیں کر سکتی۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دنا۔ ''ثمینہ''

ناز کے پیروں کے نیچے زمین نکل گئی لیکن وہ مضبوط اعصاب کی عورت تھی اس نے ہمت نہیں ہاری۔ پولیس میں رپورٹ درج کرائی۔ پولیس کی تلاش کامیاب رہی۔ثمینہ دستیاب ہو گئی لیکن کچلی ہوئی لاش کی شکل میں پولیس کی تفتیش سے پتہ چلا عاصم نے زیورات اور نقدی لے کر اس کو ریلوے لائن پر ڈھکیل دیا تھا کہ قتل خودکشی ثابت ہو۔

ثمینہ کی لاش کو گھر لایا گیا۔ ناز کو سکتہ ہو گیا وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اکلوتی اولاد کو دیکھ رہی تھی۔ آفاق نپے تلے قدموں سے قریب آئے۔ آفاق کو دیکھ کر ناز کا سکتہ ٹوٹ گیا۔ وہ ان کے قدموں سے لپٹ گئی۔

''مجھے معاف کر دے بیٹا'' میں نے تیرا گھر اُجاڑا ہے۔ تیرے معصوم بچے سے ممتا کی چھاؤں میں نے چھینی ہے۔ تیری بیوی بے قصور تھی وہ تحریر میں نے بچے کی کنپٹی پر ریوالور رکھ کر جبریہ لکھوائی اور اندھیری رات میں گھر سے نکال دیا۔ ''وہ بچہ بچہ'' چلاتی رہی اور میں جیت کے نشے میں ہنستی رہی۔ میں لالچ میں اندھی ہوگئی تھی۔ میں ڈائن ہوں، ڈائن، مار ڈالو مجھے۔'' وہ چیخوں کے درمیاں کہہ رہی تھی اور پھر اس کی چیخیں ہدیانی چیخوں میں تبدیل ہوگئیں۔

آفاق ایک بار پھر زلزلوں کی زد میں تھے وہ تیز قدموں سے اپنے بیڈروم میں چلے

گئے۔ چٹانیں چیخ رہی تھیں دراڑیں نمودار ہو رہی تھیں۔ روح گریہ کناں تھی دل زخمی پرندے کی مانند۔

بیڈروم میں جانے کی کسی کی بھی ہمت نہیں تھی۔ وفادار اور دمساز چھٹن سے ان کی یہ حالت نہیں دیکھی گئی وہ کمر کس کر ایک بار پھر محبت، نفرت، انتقام کی رن بھومی میں کود گئے اور آفاق کو تسلی دلاسے دینے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔ آہنی انسان آفاق چھٹن کے شانے سے سر لگا کر بلک پڑے۔ برسوں کا لاوا ابلنے لگا۔ چھٹن کو خدشہ تھا کہیں وہ پھر دماغی شاک کی زد میں نہ آ جائیں۔

چھٹن نے آفاق سے کہا کہ وہ بیوی کو تلاش کریں لیکن آفاق کا خیال تھا کہ یہ کوشش بے سود ہے اتنے بڑے سانحہ کے بعد وہ زندہ نہیں بچی ہوگی۔

''میاں اُمید پر دُنیا قائم ہے ہم اپنی سی کوشش تو کر کے دیکھیں۔'' وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ دونوں نے مل کر روپ نگر کا چپہ چپہ چھان مارا۔ ایک واقف کار سے اس کی بہن کا پتہ لے کر قریبی قصبے میں گئے۔ معلوم ہوا اس کے شوہر کو پرانی دشمنی کی بنا پر قتل کر دیا گیا اور وہ اونے پونے گھر فروخت کر کے یہاں سے چلی گئیں۔ پڑوس کی ایک عورت نے بتایا کہ ایک رات اس کی دوسری بہن بری حالت میں یہاں آئی تھی کچھ روز بعد اس نے ایک خوبصورت بچی کو جنم دیا۔

''پھر کیا ہوا؟'' آفاق نے جلدی سے کہا۔ ''پھر ہمیں کچھ معلوم نہیں زیادہ آنا جانا نہیں تھا۔ چند روز بعد شاہد کا قتل ہو گیا۔ وہ لوگ یہاں سے چلے گئے۔'' عورت نے جواب دیا۔

اب بیوی کے ساتھ ساتھ بچی کی تلاش بھی ضروری تھی۔ امید کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ شہروں، مضافاتوں، پہاڑوں کی خاک چھانتے چھانتے مہینوں بیت گئے لیکن ماں بیٹی کا کوئی سراغ ہاتھ نہیں آیا وہ بری طرح تھک چکے تھے۔ دلی و دماغی طور پر دیوالیہ ہو گئے تھے۔ وہ تلاش و جستجو کے راستے سے واپس پلٹ آئے اور اپنے کو مصروفیات میں الجھا لیا۔ ان کے چہرے پر چٹانوں جیسی سختی آ گئی۔ اس تمام عرصہ میں وہ خود بھی ایک ایسی چٹان بن چکے تھے جس پر ماہ و سال کی کتنی دردناک کہانیاں رقم تھیں۔ اب ان کی توجہ کا مرکز شہریار اور صرف شہریار تھا۔

چھٹن بابا کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب رواں تھا۔ شہریار اور ناصر کی آنکھیں گیلی تھیں۔ ''اُف اتنی بڑی باتیں مجھ سے پوشیدہ رکھی گئیں مگر کیوں؟''

''بیٹا آفاق نہیں چاہتے تھے یہ سب بتا کر تمہیں بے سکون کریں ان کی تاکید تھی تمہیں کچھ نہ بتایا جائے۔ آج تمہاری ضد سے مجبور ہو کر میں نے ان سے کیا عہد توڑ دیا خدا مجھے معاف کرے۔'' بابا نے سسکیوں کے درمیان کہا ''میں زمین آسمان ایک کر دیتا اپنی بدنصیب ماں اور گمشدہ بہن کو تلاشتا۔ بابا یہ آپ نے کیا کیا؟ مجھے اندھیرے میں رکھا۔

''بیٹا تمہارے باپ نہیں چاہتے تھے کہ ماں باپ کی بدنصیبی کا سایہ تمہاری روشن زندگی پر پڑے تمہارا سنہرا مستقبل اس کی زد میں آئے اور پھر جب دو چار سال ہی گزرے تھے پھر بھی تمہارے باپ کی تمام کوششیں رائگاں گئیں اور اب تو کم و بیش ۲۵ سال گزر چکے ہیں۔''

اچانک میرے ذہن میں بجلی کی طرح ایک خیال کوندا۔

''بابا وہ منحوس عورت اب کہاں ہے؟ میں اس کو بخشوں گا نہیں۔ ایک ایک ظلم کا حساب کروں گا۔'' میں نے کانپتے ہوئے بابا کے شانے تھام لئے۔

''آرام سے بیٹا آرام سے، وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے میں نے تم سے کہا تھا۔ اگرچہ یہ دنیا دارالجزا نہیں ہے پھر بھی حشرت سے پہلے اس دنیا میں بھی انسانوں کو اپنے کئے کا پھل ضرور ملتا ہے۔ اس عورت کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ بیٹی کی موت نے اس کو پاگل کر دیا۔ تمہارے نیک نفس باپ نے ایک لفظ زبان سے نہیں نکالا۔ الٹا اس کا علاج کیا۔ ایک روز اس نے اپنے آپ کو زخمی کر لیا پھر ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکی۔''

بابا کی زبانی ماضی کی یہ داستان کوہِ ہمالہ کی ایک چٹان تھی جو آنِ واحد میں مجھ پر آ گری تھی۔ وہ رات میرے لئے کسی قیامت سے کم نہ تھی۔ لگتا تھا ساری صلاحتیں کہیں گم ہو گئی ہوں دل و دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے۔ ابو بیوی بیٹی کا غم لے کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ماں، بہن دو گمشدہ ہستیاں خدا جانے دنیا کے کس کونے میں ہیں؟ ہیں بھی یا نہیں۔ کہنے کو میں جاگیر دار گھرانے کا واحد چشم و چراغ، ایک ڈاکٹر، کروڑوں کی املاک کا تنہا وارث، کیا مجھے مطمئن ہونے کو یہ سب کچھ کافی ہے ہرگز نہیں۔ میرا دنیا میں کون ہے؟ کسی صحرا میں کھڑا اکیلا درخت۔ مجھے اپنے وسیع اور شاندار بیڈ روم کی سی گرین دیواریں منہ چڑاتی ہنستی نظر آ رہی تھیں۔ جی چاہتا ہر چیز کو تہس نہس کر دوں۔ ساری دنیا کو آگ لگا دوں۔

صبح ناشتے کی میز پر بابا نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ ''بیٹا رات کو سوئے نہیں ہو''
کیا جواب دیتا ایک سرد آہ ہونٹوں پر دم توڑ گئی۔ دماغ پہلے ہی ماؤف تھا۔
''کیا سوچ رہے ہو بیٹا؟'' بابا کی شفقت سے پر آواز سماعت سے ٹکرائی۔
''کیا سوچوں بابا سب کچھ ختم ہو گیا اب تو میری زندگی کا ایک ہی جواز ہے۔ ساری سوچیں ایک محور پر آ کر رک گئی میں میں چپہ چپہ چھان ماروں گا اور امی اور بہن کو تلاش کروں گا میں سروس چھوڑ دوں گا۔'' ناصر نے چونک کر میری جانب دیکھا۔
''دیکھو بیٹا جو بیت گیا سو بیت گیا۔ دنیا کتنی بدل گئی۔ تم انہیں کہاں تلاش کرو گے؟ اور اب تو خدا جانے وہ زندہ بھی ہوں یا نہیں۔'' بابا کا لہجہ ناصحانہ تھا۔
''نہیں بابا ایسا نہ کہیں وہ ضرور زندہ ہوں گی میرا دل گواہی دیتا ہے۔'' میں نے مضبوط لہجہ میں کہا۔
''شہریار میرے دوست بھول جاؤ اس تکلیف کو ماضی کو بابا کی بات مان لو۔'' ناصر نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔
''بھول جاؤں اپنے عظیم باپ کو جو ایک بدنہاد عورت کے دیئے ہوئے زخم لے کر دنیا سے چلا گیا۔ بھول جاؤں اس ماں کو جو رات کے اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے اس وسیع و بے مہر دنیا میں کہیں گم ہو گئی۔ اس بہن کو بھی بھول جاؤں جو یہ بھی نہیں جانتی کہ اس کا کوئی جوان بھائی بھی ہے۔ اس کا محافظ، کیا کیا بھول جاؤں''
''دیکھو شہریار میں یہ نہیں کہتا کہ تم ان کی تلاش مت کرو بلکہ میں خود تمہارا پورا ساتھ دوں گا لیکن سروس چھوڑنے دینا سے جوگ لینے کی حماقت میں ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔'' ناصر کے لہجے میں استحقاق تھا۔ وہ دیر تک سمجھاتا رہا میرا بہترین دوست بچپن کا ساتھی، جوانی کا دمساز؟
حقیقت ہے کہ ایک سچا دوست بھی خدا کی رحمت اور آسمانی تحفہ ہوا کرتا ہے۔ ناصر کی تسلیوں اور بابا کی شفقت نے میری روح کے بوجھ کو ایک حد تک کم کر دیا۔ ذہن میں جو الاؤ جل رہا تھا اس کی تپش دھیمی ہو گئی۔ ناصر نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر رضامند کر ہی لیا۔
''بیٹا میری بات غور سے سنو آفاق چلے گئے ابھی ان کے جانے کی عمر نہیں تھی لیکن خدا

کے قانون میں کون دخل دے سکتا ہے اب مجھ بوڑھے کا کیا بھروسہ کب اوپر والے کا بلاوا آ جائے۔ بیٹے اپنی بدلی یہیں کرا لو۔ میں ٹوٹ چکا ہوں اتنی بڑی جاگیر و کوٹھی کا انتظام میرے بس سے باہر ہے۔ تم اپنا گھر بسا لو۔ تمہارے باپ کی بھی یہی خواہش تھی۔ اللہ نے چاہا تو یہ ویران کوٹھی تمہارے بال بچوں سے آباد ہو جائے گی۔'' بابا نے بھرے گلے سے کہا ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

''بابا آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں آپ کو جینا ہوگا میرے لئے سیرا آپ کے علاوہ اب اور کون ہے میں ان کے گلے لگ گیا۔

بابا کو دلاسہ دے کر اور جلدی آنے کا وعدہ کر کے ہم دونوں روانہ ہو گئے۔ ہاسپٹل پہنچتے پہنچتے کافی رات ہو چکی تھی۔ تھکن غالب تھی کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں جلد ہی سو گیا۔ معمول کے مطابق صبح جلدی بیدار ہوا۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر نماز فجر ادا کی دیر تک ابو کی مغفرت کی دعا کرتا رہا۔ دل میں سکون اترتا جا رہا تھا۔ سچ ہے نماز قرب الٰہی کا سب سے آسان ترین راستہ ہے۔ میرا بچپن زیادہ تر بابا کی گود میں گزرا انہوں نے بچپن سے ہی مجھے خدا کی عبادت کی تلقین کی۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر جیسے مصروف ترین پیشہ سے وابستہ ہو کر میں نماز سے کبھی غافل نہ رہا۔

رہائشی فلیٹ ''دارالشفا'' کی دوسری منزل پر تھے۔ نیچے ڈاکٹروں کے چیمبر روم آپریشن آئی، سی، یو اور مختلف ڈپارٹمنٹ کے ساتھ ساتھ جنرل وارڈ اور اس کے عقب میں پرائیویٹ روم تھے۔

میرے اور ناصر کے روم الگ الگ ضرور تھے لیکن صرف رات کے سونے کی حد تک۔ باقی کا تمام ٹائم فرصت کے اوقات میں ساتھ ہی گزرتا۔ صبح کا ناشتہ بھی ساتھ ہوتا ایک بوڑھی ماسی صبح آ کر دونوں کا ناشتہ تیار کرتی صفائی وغیرہ کر کے دوپہر سے پہلے چلی جاتی۔ کھانا ہم لوگ کانٹین سے کھاتے۔ ماسی باتیں بہت کرتی جتنی تیزی سے اس کے ہاتھ چلتے اس سے کہیں زیادہ تیزی سے زبان۔ وہ چلتا پھرتا اخبار تھی۔ ناصر بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سنا کرتا اور بیچ بیچ میں چلتے پھرتے سوال بھی کرتا۔ مزید آٹھ بجنے والے تھے میں جلدی جلدی تیار ہوا ناشتہ کی میز پر ناصر پہلے سے موجود تھا۔

''یار ماسی نے صبح صبح ایک خبر سنائی تصدیق کے لئے مجھے نیچے جانا پڑ گیا۔ ناصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کوئی نئی بات بتاؤ۔ وہ ہمیشہ ہی بے سروپا خبر سناتی ہے ہاں، تم کس بات کی تصدیق کر نے نیچے گئے تھے۔'' ''وہی تو بتانے جا رہا ہوں بلکہ آنکھوں سے دیکھ کر آرہا ہوں۔'' کیا؟ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

ماسی نے بتایا تین روز پہلے ایک مریضہ ہاسپٹل لائی گئی تھیں ان کے ساتھ ایک ایسی خوبصورت لڑکی تھی بقول ماسی ''بھیا ہم نے جندگی میں ایسی کھوبصورت (خوبصورت) لونڈیا نہیں دیکھی بس اللہ پیارے کو کوئی حور دور ہے۔'' ناصر نے ماسی کے لہجہ کی نقل اتارتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''تو تم اس حور کو نظارہ کرنے نیچے گئے تھے۔ شرم کرو کیوں ڈاکٹروں کے معزز پیشے کو بدنام کرنا چاہتے ہو۔'' میرا لہجہ خشمگیں تھا۔ ''ارے احمق پوری بات تو سن وہ وہی لڑکی ہے'' ناصر نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''کون لڑکی؟ کیا بکواس ہے؟''

''یار ان دونوں محترماؤں میں سے ایک یہاں ایڈمٹ ہیں لڑکی انہیں کے ساتھ ہے'' ناصر نے کہا۔ ''کون محترمائیں؟ کس کی بات کر رہا ہے'' میرا انداز سرسری تھا۔

''یار وہی حویلی والی روحیں جہاں مجھے لے گئے تھے۔ ہمیں ڈھونڈتی ہوئی یہاں تک آ پہنچیں۔'' ناصر نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔

''کیسی روحیں کیا بک رہے ہو؟'' ''بک نہیں رہا فرما رہا ہوں اس اجاڑ حویلی میں دو عورتیں تھیں ایک ہماری موجودگی میں بے ہوش ہو گئی تھیں۔''

''اوہ یاد آیا کیا ہوا انہیں یہاں کیسے آئیں؟''

یہ سب تو معلوم نہیں میں نے جا کر دیکھا وہ جنرل وارڈ میں ہیں شاید ہارٹ وغیرہ کا پرابلم ہے۔'' ناصر نے وضاحت دی۔

''ناشتہ کے بعد چلو انہیں دیکھ لیتے ہیں شاید انہیں ہماری مدد کی ضرورت ہو۔'' میرے ذہن سے موجودہ حالات کے پیش نظر وہ واقعی محو ہو گئی تھیں۔ لیکن ایک طریقہ سے محسن تھیں انہوں نے طوفانی رات میں مجھے پناہ دی تھی۔

میں ناصر کے ساتھ جنرل وارڈ میں آیا سب سے آخیر میں کونہ والے بیڈ کی طرف ناصر

نے اشارہ کیا ایک خاتون سینے تک کمبل پھیلائے سو رہی تھیں۔ دوسری بیڈ کی برابر چیر پر بیٹھی تھیں۔ بیڈ کے پائنتی پر ایک لڑکی تھی جس کا تعارف ناصر پہلے ہی دے چکا تھا۔

قدموں کی آہٹ پر انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا ''السلام علیکم''

بیٹا تم لوگ کہاں چلے گئے تھے ہم بڑی پریشانی میں آ گئے تھے۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے خاتون نے کہا۔

''ایمر جنسی تھی چھٹی لے کر گھر جانا ضروری تھا۔ ان آنٹی کو کیا ہوا؟ شاید ویسا ہی بیہوشی کا دورہ پڑا ہوگا جو اس رات میرے سامنے ہوا تھا۔'' میں نے پرشش احوال کے ساتھ اپنا خیال بھی ظاہر کیا۔

''نہیں بیٹا اس بار ایسا نہیں تھا پہلے تو میں نے بھی یہی سمجھا کہ عام سا دورہ ہے ہوش آ ہی جائے گا بہت دیر ہوگئی تو نغمہ گھبرا کر ایک ڈاکٹر صاحب کو لے آئی۔ وہ ہماری حویلی کے پچھواڑے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر تو معمولی ہیں لیکن دردمند دل رکھتے ہیں۔ انہوں نے بتایا دل کا شدید دورہ ہے۔ بیچارے خود ہمارے ساتھ آئے۔ یہاں آ کر میں نے تم دونوں کو بہت تلاش کیا۔''

''اب تو بہتر معلوم ہوتی ہیں'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں بس زندگی تھی بچ گئی۔''

''بہت اچھا ہوا انہیں آپ یہاں لے آئیں ڈاکٹر وقار دل کے مانے ہوئے اسپیشلسٹ ہیں۔ ویسے ہم لوگ بھی ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں۔''

خاتون کو تسلی دے کر میں اپنے چیمبر میں آ گیا۔ مریضوں کے رش میں ٹائم کا پتہ ہی نہ چلا۔ تقریباً دو بجے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں جانے سے پہلے میں ایک بار پھر ان کی خیریت دریافت کرنے لگا۔ اس وقت وہ بیدار تھیں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھیں چہرے پر انتہائی نقاہت تھی۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں وہی اسرار چمک لہرائی جو میں اس سے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ ''آؤ آؤ بیٹا تم کہاں تھے؟''

''آنٹی آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' میں نے ان کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''بہت سخت جان ہوں خدا جانے دکھوں کا باران ناتواں کاندھوں پر کب تک ڈھوتی رہوں گی۔'' ''تم نے پھر وہی باتیں شروع کردیں۔'' عذرا نٹی نے درمیان سے بات کاٹی۔

مجھے اس وقت یہ دونوں عورتیں انتہائی ستم رسیدہ لگیں۔ پتہ نہیں غریبوں کے ساتھ کیا کیا مسائل ہیں۔ ایک عورت خواہ کسی عمر کی ہو مرد کی سرپرستی انتہائی ضروری ہے۔ وہ ایک ایسی بیل ہے جس کے پھلنے پھولنے کے لئے کسی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کی عورت ترقی کے نام پر جس اندھی ڈور کا شکار ہوکر تنہا جینا چاہتی ہے یہ سب پاگل پن ہے۔ قانون قدرت سماج و مذہب سے انحراف ہے۔ روزِ اول سے ہی مرد عورت کی سہارا اس کا سائبان ہے کبھی باپ اور بھائی بن کر کبھی شوہر اور بیٹے کے روپ میں۔ یہ مضبوط ستون ہیں جو ہر قدم پر اس کو سہارا دیتے ہیں۔ قرآن میں بھی اللہ تبارک وتعالی نے واضح الفاظ میں مرد کو عورت پر فضیلت عطا کی ہے۔ عورت کو صنفِ نازک کا لقب دینے والے غلط نہیں ہوسکتے۔

شام میں راؤنڈ پر نکلا ہی تھا کہ عذرا آنٹی تیز تیز قدموں سے میری طرف آتی دکھائی دیں۔ ''بیٹا ڈاکٹر صاحب نے گھر جانے کی اجازت دیدی ہے۔ اب ہاسپٹل کے خرچ کے پیسے کس کو دینا ہے؟ ہم یہاں کے قاعدے قانون نہیں جانتے بیٹا تم تھوڑی مدد کردو۔'' انہوں نے چند نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ پیسے رکھئے میں ابھی آیا'' ''نہیں بیٹا ہم غریب ضرور ہیں لیکن کسی کا پیسہ نہیں لے سکتے۔'' انہو نے عقب میں آتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال انہیں رکھئے میں خود آپ لوگوں کو گھر تک پہنچادوں گا۔ گھر جا کر لے لوں گا۔'' ہاسپٹل کی ایمبولنس کے ذریعہ میں نے ان کو حویلی پہنچایا۔ ناصر ہمراہ تھا۔

''آج ضرور حقیقت معلوم کروں گا۔'' ذہن میں سوچ در آئی۔ میں نے انگلش میں ناصر سے مشورہ طلب کیا۔ وہ خلاف عادت نہ جانے کیا سوچ رہا تھا اثبات میں سر ہلا کر خاموش ہوگیا۔

حویلی پہنچ کر عامرہ آنٹی بیڈ پر نیم دراز ہوگئیں ہم دونوں ساتھ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عذرا خاتون اور ان کی بیٹی ہاسپٹل سے لائے سامان کو ادھر اُدھر رکھنے میں مصروف تھیں۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ بات کو کہاں سے شروع کروں کہ اچانک ناصر گویا ہوا۔

”آنٹی بیہوشی کے دورے عام طور پر مرگی وغیرہ کے ہوتے ہیں جن کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے۔ڈاکٹر وقار بتا رہے تھے کہ کسی اچانک صدمے سے آپ کا ہارٹ متاثر ہوا۔“ ناصر کا سوال سن کر ان کی آنکھوں میں گہرے کرب کی پر چھائیاں واضح ہو گئیں۔عذرا آنٹی بھی آ کر بیڈ کے پائنتی بیٹھ گئی تھیں۔

”بیٹا سچ کہتے ہو دماغی مریض تو سدا کی ہیں لیکن اب جو صدمہ گزرا اس کو دل پر لے گئیں۔“ انہوں نے ہماری طرف اپنائیت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آنٹی کہہ دینے سے دل کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔آپ ہمیں بتایئے شاید کسی کام آ سکیں“ میں نے انہیں پٹری پر آتا دیکھ کر جلدی سے کہا۔

”بیٹا تم نے کہہ دیا یہی بہت ہے۔بس کیا بتاؤں اخبار کا ایک نامراد پرزہ اس کی جان کا لاگو بن گیا۔“ ان کی آواز گلوگیر تھی۔”اخبار کا پرزہ!وہ کس طرح؟میری حیرت بجا تھی۔

”لو بیٹا اگر سننا ہی چاہتے ہو تو سنو ہمارے یہاں اخبار تو آتا نہیں فالتو کا خرچہ ہے۔ تھوڑی آمدنی اور تم جانو تین جانوں کا خرچہ۔نغمہ کی سہیلی نے اس کو پڑھنے کے لئے اخبار میں لپیٹ کر کچھ کتابیں دیں۔وہی پچھواڑے والے ڈاکٹر صاحب کی بچی بڑی بھلی ہے۔“

”آپ اخبار کے بارے میں بتا رہی تھیں“ میں نے غیر ضروری طوالت اور موضوع سے ہٹتا دیکھ کر دریافت کیا۔

”وہی بتانے جا رہی ہوں، یہ اسے اٹھا کر پڑھنے لگیں دیکھتے دیکھتے حالت غیر ہو گئی میں بری طرح گھبرا گئی۔اگر پڑوس کے ڈاکٹر صاحب مہربانی نہ کرتے تو خدا جانے کیا ہوتا“ بات کرتے کرتے انہیں اچانک بل کی رقم یاد آ گئی۔”بیٹا یہ پیسے تو رکھ لو تم دونوں نے بڑا ساتھ دیا اللہ تعالیٰ ماں باپ کا کلیجہ ٹھنڈا رکھے۔“

”ابھی رکھئے میں لے لوں گا ہاں آپ مجھے وہ اخبار دکھا سکتی ہیں“ ”دیکھتی ہوں یہیں کہیں ہوگا“ انہوں نے عقب کی الماری دیکھتے ہوئے کہا۔”لو یہ رہا منحوس اخبار“ انہوں نے ”قومی آواز“ کا ایک صفحہ دیتے ہوئے کہا۔اس پر مقامی خبریں تھیں یہ بارہ اپریل کا تھا۔جلی حرفوں میں لکھا تھا۔”مشہور ہارٹ اسپیشلسٹ ڈاکٹر آفاق نہیں رہے۔“

میں پہلے بھی اس کو پڑھ چکا تھا الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے میں ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ناصر نے وہ صفحہ میرے ہاتھ سے لے کر غور سے دیکھا یکا یک اس کی آنکھیں چمکنے لگیں جسے وہ کسی نتیجہ پر پہنچ گیا ہو۔

''اس میں ڈاکٹر آفاق کی موت کی خبر کے علاوہ اور تو کچھ نظر آتا نہیں کیا آنٹی کو اس خبر سے شاک پہنچا ہے'' ناصر کا لہجہ عجیب سا تھا۔ ''تم نے ٹھیک سمجھا بیٹے'' عذرا بول اُٹھیں۔

''عذرا خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ'' کپکپاتی آواز میں عجیب بے کسی تھی۔ ''وہ تو خاموش ہو جائیں گی لیکن میں خاموش نہیں رہوں گا'' میں تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور انہیں شانوں سے تھام لیا۔ ''تم انہیں کیسے جانتے ہو'' انہوں نے اُلٹا مجھ سے سوال کیا۔

''جاننے کا کیا سوال؟ میں ان کا بیٹا ہوں'' ''شہریار میرے بچے، میرے بیٹے'' انہوں نے بے اختیارانہ مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔

میری پیشانی اور آنکھوں کو دیوانہ وار چومنے لگیں میں ان کی بانہوں کے حصار میں تھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ میری آنکھیں بھی برس رہی تھیں جس قدر آنسو آج میں نے بچھڑی ہوئی ماں کے سینے سے لگ کر بہائے اتنے شاید باپ کی ابدی جدائی پر بھی نہ رویا۔

''بیٹے یہاں سے فوراً چلے جاؤ کسی سے مت کہنا کہ مجھ سے ملے ہو۔ ورنہ وہ ڈائن تمہیں مار ڈالے گی'' بے ربط الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھری رہے تھے۔ اچانک ان کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ میں نے فوراً ایک ٹیبلیٹ نکالی اور عذرا آنٹی کی مدد سے ان کو دی۔

''بابا سے پوری داستان سننے سے بعد میں جان گیا کہ وہ کیوں خوف زدہ ہیں۔ ایک لالچ کی ماری ظالم عورت نے ایک معصوم سادہ لوح عورت کا سہاگ اس کا سکھ چین ہی نہیں چھینا تھا بلکہ عمر بھر کے لئے ممتا کی صلیب پر مصلوب کر دیا تھا۔

''آپ دل سے سارے اندیشوں کی چادر اتار دیجئے آپ کو برباد کرنے والی اپنے انجام کو پہنچ گئی ہے۔'' ناصر نے میرے قریب بیٹھے ہوئے کہا۔ ''بیٹا سچ کہہ رہے ہو؟''

''بالکل سچ چھٹن بابا نے ابو کے سوئم کے روز مجھے سب کچھ بتا دیا اور یہ بھی کہ حقیقت جان کر انہوں نے آپ کو بہت تلاش کیا۔ چپہ چپہ چھان مارا دن رات ایک کر دیا لیکن ناکام رہے۔

اس نے اس کی صحت پر اثر ڈالا۔ کاش بابا مجھے ان کی زندگی میں سب کچھ بتا دیتے تو اس طرح محروم دنیا سے رخصت نہ ہوتے۔ لیکن بابا بھی کیا کرتے ابو نے ان سے عہد لیا تھا کہ وہ کبھی مجھے اس راز کی ہوا نہیں لگنے دیں گے۔" پاپا کے ذکر پر ایک بار وہ پھر بے آواز رونے لگیں۔

"بس کرو عاصرہ، یہ رونے کا نہیں خوشی اور شکر کا مقام ہے۔ تمہارا بچہ تمہیں مل گیا آفاق سے ملنا تمہارے نصیب میں نہیں تھا اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں آخر اسے تمہارے اوپر رحم آ ہی گیا۔ تم کس کس طرح اپنے بچے کے لئے تڑپی ہو یہ مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔" انہوں نے مادرانہ شفقت سے آگے بڑھ کر ان کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا ابھی ماں کو بیٹا بیٹے کو ماں اور وہ کیا کہتے ہیں خالہ کو بھانجہ مل گیا۔ میں کباب میں ہڈی کی طرح اٹکا ہوا ہوں، میں چلا" ناصر کی فطری شوخی عود کر آئی۔ "نہیں بیٹا تم شہریار کے دوست ہو میرے لئے بیٹے جیسے ہی ہو" "بھئی یہاں تو اس ملن کی خوشی میں چائے تک ندارد ہے۔ آپ روکنے کو کہہ رہی ہوں" ناصر نے پھر کہا۔

"عذرا مجھے سہارا دو آج اپنے بچوں کے لئے چائے میں خود بناؤں گی۔" انہوں نے بد قت اٹھتے ہوئے کہا۔ "اس گھر کا عجب دستور ہے گھر میں لڑکی ہوتے ہوئے بزرگ چائے بنائیں" ناصر نغمہ کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر عورتوں جیسے انداز سے کہا۔

خوشیاں کچھ اس طرح مجھ پر ٹوٹ کر برسی تھیں کہ میں وقتی طور پر یہ بھی بھول گیا کہ میری تلاش کا ماحصل ایک بہن بھی ہے۔ بابا نے مجھے ایک بہن کی بھی نوید دی تھی۔ میں نے ماں کو تلاش کر لیا یا پھر یوں کہنا چاہیے وہ مجھے بغیر تگ و دو کے مل گئیں۔ ماں کیا ہوتی ہے یہ مجھے ماں کو دیکھ کر اس کے لمس کو محسوس کر کے اندازہ ہوا۔ ماں کتنا پیارا لفظ ہے **ملٹن** کے الفاظ میں "ماں آسمان کا بہترین تحفہ ہے"

چائے کے سپ لیتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ان کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی ہیں۔ عذرا آنٹی نے تشویش سے میری طرف دیکھا۔ "فکر مت کریں دراصل سکون آور دوائیں دی جا رہی ہیں۔ انہیں بے فکری سے سونے دیں" میں نے تسلی دی۔ اب ہم لوگ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے تا کہ ان کے سکون میں خلل واقع نہ ہو۔ "آنٹی میری ایک بہن بھی تھی اب وہ کہاں ہے؟"

میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''تمہیں کیسے معلوم؟'' ان کی حیرت بجا تھی۔
میں نے چھٹن بابا سے سنی واردات کا وہ حصہ انہیں سنایا جب تلاش کے دوران ابو کو معلوم ہوا تھا کہ ان کے ایک بیٹی بھی ہے.......... ''بیٹے تم نے یہ کیا ذکر چھیڑ دیا لمبی کہانی ہے۔ میں تمہیں شروع سے بتاتی ہوں''

''روپ نگر کے قریبی قصبے میں میری شادی چچازاد شاہد سے ہوئی تھی۔ گزر بسر کے لئے چچا کی چھوڑی ہوئی زمین تھی۔ خوشحالی بے فکری تھی۔ عامرہ کو ایک جاگیردار بیاہ کر لے گیا۔ اس کی طرف سے بھی سکون ہی سکون تھا۔ اس کی ساس بڑے ارمانوں اور چاہ سے بہو اور پوتے کو لے کر لکھنو گئی تھیں اس روز صبح سے دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے بھاری دل سے روزمرہ کے کام کئے رات سے بارش شروع ہوگئی۔

وقفے وقفے سے رات بھر برستی رہی۔ قصبوں اور دیہاتوں کی صبح بہت جلدی ہو جاتی ہے میں نے کیتلی میں چائے کا پانی رکھا شاہد نے کسی کام سے باہر جانے کے واسطے جوں ہی دروازہ کھولا کوئی گٹھری نما چیز ان کے پیروں کے پاس گری۔''

''عذرا جلدی آؤ دیکھو کون ہے؟'' میں لشتم پشتم بھاگی آئی۔ وہ بظاہر بھیگے کپڑوں کی ایک گٹھری نظر آئی تھی۔ ''اف پتہ نہیں کون ہے'' میں نے جلدی سے سیدھا کیا بے اختیار میری چیخ نکل گئی۔ وہ اور کوئی نہیں میری بہن عامرہ تھی۔ شاہد بھی آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔

''شاہد یہ کیا ہو گیا میری بہن اس حال میں؟'' میں نے شاہد کو جنونی انداز میں جھنجھوڑا۔

''حواس ٹھیک کرو عذرا جلدی سے اس کے گیلے کپڑے بدلو میں کسی ڈاکٹر کو لاتا ہوں''
شاہد نے جھک کر اس کی نبض ٹٹولی۔ علاج ہوتا رہا۔ بخار جاتا رہا۔ سانس کی رفتار بھی معمول پر آ گئی لیکن اس تمام عرصہ میں وہ ہوش و بیہوشی کے درمیان رہتی تھی۔ بظاہر صحت مند تھی لیکن منہ سے ایک لفظ نہیں بولتی۔ زیادہ تر خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ میری اور شاہد کی ساری کوششیں رائگاں ہوگئی لیکن اس کی زبان کھلوانے میں ناکام رہے۔ خدا ہی جانے اس پر کیا بیتی تھی۔ ہم لوگوں نے قصبے کے واحد ڈاکٹر سے بات کی انہوں نے شہر کے کسی اچھے ہاسپٹل لے جانے کو کہا بلکہ ایک ہاسپٹل کا نام بھی لکھ کر دے دیا۔ دوسرے ہی روز ہم شہر چلے گئے۔ ڈاکٹر نے بتایا کسی شدید دماغی صدمے

نے گویائی پر اثر ڈالا ہے۔ ہم ایک مہینہ ہاسپٹل میں رہے اس تمام عرصہ میں شاہد نے کوئی کسر نہیں چھوڑی وہ کوئی غیر نہیں عامرہ کے سگے چچازاد تھے دوہرا رشتہ تھا۔

''ایک رات سوتے سوتے وہ اچانک چیخ اٹھی ''نہیں نہیں میرے بچے کو مت مارنا میں آفاق کو کبھی اپنی صورت نہیں دکھاؤں گی۔''

''اس کے الفاظ بجلی بن کر مجھ پر گرے میں نے اس کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا وہ سر سے پیر تک پسینہ میں شرابور تھی اس کی حالت دیکھ کر شروع میں ہم دونوں یہی سمجھتے تھے کہ آفاق نے جاگیردار ہونے کے ناطے اس سے قطع تعلق کر کے کوئی اور حسین دنیا بسالی ہو۔ یہ نواب زادے، جاگیردار حسین لڑکیوں کو ایک کھلونے سے زیادہ نہیں سمجھتے جب تک جی چاہا کھیلے ورنہ توڑ پھوڑ کر برابر کیا لیکن یہ کیا؟ یہ تو کوئی اور ہی اسرار ہے۔

اب وہ آہستہ آہستہ زندگی کی طرف آ رہی تھی دو چار لفظ بھی بولتی راز آخر کیسے کھلے؟ ہمارے پاس آفاق کا پتہ بھی نہیں تھا کیا کرتے کیا نہ کرتے جلد ہی وہ ماں بننے والی تھی۔

ایک سہانی صبح اس نے کلی جیسی حسین و معصوم بچی کو جنم دیا۔ مجھے لگا بچی کی پیدائش کے بعد وہ کچھ اور ڈری سہی رہنے لگی۔

شاہد کو بچے بہت پیارے تھے اور میری گود سونی۔ ہم دونوں کا زیادہ وقت ننھی گڑیا کے ساتھ گزرتا۔ ایک رات اچانک اس نے ہم دونوں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے'' عذرا شاہد بھائی میری بچی کو اپنالو'' وہ کانپ رہی تھی۔

''کیا بات ہے عامرہ تم کیا کہہ رہی ہو شاہد اس کے قریب آ بیٹھے اور سر پر ہاتھ رکھ کر دریافت کیا۔'' بھائی میری معصوم بچی کو بچالو اسے تم دونوں اپنالو، ورنہ یہ بھی مجھ سے چھن جائے گی۔'' اس کے بے ربط الفاظ آنسوؤں میں بہنے لگے۔

''عامرہ ہم تمہاری بچی کو ایک شرط پر اپنانے کو تیار ہیں تمہیں بتانا پڑے گا کہ تمہارے ساتھ کیا بیتی تم کون سی انہونی کا شکار ہو؟ کس سے ڈری ہوئی ہو؟ شاہد نے مضبوط لہجہ میں کہا۔

تب عامرہ نے ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان جو کچھ اس پر بیتا تھا کہہ سنایا یہ بھی کہ اگر اس نے کبھی آفاق سے ملنے کی کوشش کی تو وہ عورت بچے کو ختم کر دے گی۔

''اس نے بچی کو میری گود میں ڈال دیا'' عذرا اس کے علاوہ میرے پاس آفاق کی کوئی نشانی نہیں ہے اور اسے بھنک بھی مل گئی تو یہ بھی مجھ سے چھن جائے گی۔ ہائے میرا معصوم شہریار کس کس طرح مجھے یاد کرتا ہوگا'' وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی ممتا کی ماری ایک ناگن کی ڈسی ہوئی۔

''عذرا تم میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ تم کسی کو یہاں تک کہ اس بچی کو بھی یہ نہیں بتاؤ گی کہ اس کی ماں میں ہوں'' اس نے میرا ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر کہا۔

ابھی دو ماہ بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ ہم پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ کھیت کی زمین پر شاہد کا جھگڑا ہوا۔ ظالموں نے اسے ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ میں نے مکان اور زمین فروخت کر دی اور قبضہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ سر چھپانے کے لئے جگہ کی ضرورت تھی۔ عامرہ کی خواہش تھی ہم ایسے مقام پر رہیں جہاں کوئی جاننے والا نہ ہو۔ یہ حویلی کے آسیب زدہ مشہور تھی۔ کوئی لینے پر آمادہ نہیں تھا اس کے مالک نے خوشی خوشی کم داموں میں دیدی۔ ہمیں سر چھپانے کو جگہ مل گئی۔ دور دور چند مکان ہیں جس کے رہنے والے اپنی دنیا میں مگن، بس بیٹا یہ تھی ساری کہانی۔ عذرا خاموش ہو گئیں۔

''آنٹی یہ آسیب زدہ ہے پھر تو آپ سب کو آسیبوں نے تنگ کیا ہوگا'' ناصر نے شوخ لہجہ میں دریافت کیا۔

''نہیں بیٹا ہم تقریباً بیس بائیس سال سے یہاں رہ رہے ہیں۔ آسیب وہم سے زیادہ کچھ نہیں ہے ہم انسانوں کے ستائے ہوئے ہیں۔ ظالم اور سنگدل انسانوں سے زیادہ کوئی آسیب نہیں۔

''شہریار اِدھر دیکھو'' ناصر کی گھبرائی ہوئی آواز پر میں نے مڑ کر دیکھا۔ نغمہ پتہ نہیں کب سے عقب کی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی سرخ سفید رنگت ہلدی کی طرح زرد تھی وہ زار قطار رو رہی تھی۔ میں اٹھ کر اس کے قریب گیا اسے بانہوں میں بھر کر سینے سے لگا لیا۔ ''نہ رو میری بہن'' خدا کا شکر ادا کرو'' وہ میرے شانے سے سر ٹکائے بے اختیار رو ئے گئی۔

''بھائی بھائی میرا جیسا بدنصیب بھی کوئی ہوگا باپ بھائی سے دور رہی ماں کے قریب رہتے ہوئے خالہ کے روپ میں پایا۔ ہائے بھائی آپ اب تک کہاں تھے میں پاپا کو بھی نہیں دیکھ سکی۔'' اس کے آنسوؤں سے میری قمیض گیلی ہو گئی تھی۔ میرے پاس تسلی کے سارے الفاظ ختم ہو

گئے تھے۔ خاموشی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ اس دوران امی جاگ کر یک ٹک بہن بھائی کا ملن دیکھ رہی تھیں۔

''بھئی حویلی تو سیلاب کی زد میں ہے۔ ساون گھن گرج کے ساتھ برس رہا ہے میں تو چلا'' ناصر نے ماحول میں چھائی اداسی کا تاثر کم کرنے کو ہنس کر کہا۔

''ٹھہر یار مجھے بھی تو جانا ہے رات کافی ہو چکی ہے'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اب کہا جانا ہے بھائی میں آپ کو کہیں جانے نہیں دوں گی۔'' نغمہ نے بھائی کو کندھوں سے تھام لیا۔

''میری گڑیا اس وقت تو میرا ہاسپٹل جانا ضروری ہے میں صبح آؤں گا آپ سب تیار رہنا صبح انشاء اللہ لکھنؤ چلیں گے اپنے گھر، ابو کے گھر۔''

''لیکن بیٹا'' عامرہ نے کچھ کہنا چاہا۔ کچھ لیکن ویکن نہیں امی اندیشوں کی چادر اتار پھینکئے۔ آپ کا گھر آج بھی آپ کا منتظر ہے۔'' بابا آپ سب کو اور خاص کر اس گڑیا کو دیکھ کتنا خوش ہوں گے ہم سب سے وہ کتنا پیار کرتے ہیں آپ اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ ابو کے بعد وہ ٹوٹ گئے ہیں۔

''بیٹا تم شوق سے اپنی ماں، بہن کو لے جاؤ لیکن میں کہیں جانے والی نہیں'' عذرا آنٹی درمیاں میں ہوئیں۔ ''واہ یہ کیسے ممکن ہے کیا میں آپ کا کچھ نہیں ہوں'' میں نے لاڈ سے کہا۔

''آنٹی بہت رہ لیں اس حویلی میں اب بیچارے آسیبوں پر رحم کیجئے انہیں آرام سے یہاں رہنے دیں'' ناصر نے مسکرا کر کہا۔

دوسرے دن میں تینوں کو لے کر لکھنؤ پہنچا۔ ناصر میرے ہمراہ تھا۔ بابا اتنی جلدی میری آمد پر حیران ہوئے۔ ''دیکھئے بابا میں کس کو لے کر آیا ہوں۔ میں نے ان کے گلے لگتے ہوئے کہا۔

''یہ میری بوڑھی آنکھیں یہ کیا دیکھ رہی ہیں ''دلہن'' بابا نے امی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ میرے آفاق کی بچی'' انہوں نے نغمہ کو اپنی پر شفقت آغوش میں لے لیا۔

''کاش آفاق تم نے جانے میں اتنی جلدی نہ کی ہوتی کس کس طرح وہ اپنی بچی کو یاد کر کے روئے۔'' بابا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

''بابا بھول جاؤ سب آج خوشی کا دن ہے، ابو اتنی ہی عمر لے کر آئے تھے۔'' چاروں طرف رنگ و نور کی کہکشاں خوشبوؤں کی مہک ہے۔ سچ ہے انسان تقدیروں کے رازوں سے

نا آشنا رہتا ہے۔ لیکن ہر سیاہ رات کی ایک روشن صبح ضرور ہوتی ہے ہر کسی کو اپنے اپنے حصے کی
خوشیاں چننا ہوتی ہیں۔

حدِ پرواز

کپڑا مل کے مالک سیٹھ فخر الدین کے وسیع و عریض جگمگاتی ہوئی کوٹھی میں ویسے تو صرف تین نفوس تھے جو مالکانہ حقوق رکھتے تھے۔ فخر الدین اور اس کے ماں باپ نصیر الدین اور نصیبن باقی کی خانہ پری ملازموں سے کر دی گئی تھی۔ لیکن کپڑا ضرورت سے کہیں زیادہ تھا مالک تو مالک ملازموں کے پاس بھی ضرورت سے زیادہ جوڑے تھے۔ شاید یہی کشش تھی جو مالکوں کی بدمزاجی کے باوجود ان کو دوسری جگہ جانے سے روکتی تھی۔

کہا جاتا ہے انسان کی بنیادی ضرورتیں تین ہیں روٹی، کپڑا اور مکان لیکن ان تین بنیادی ضرورتوں میں اولیت کپڑے کو حاصل ہے۔ نوزائدہ بچہ ابھی لیبروم سے باہر نہیں آنے پاتا نرس آواز دیتی ہے، بچہ کے کپڑے لاؤ۔ کھانے کا مسئلہ بعد میں آتا ہے دنیا کے پہلے انسان آدم و ہوا ابھی جب اپنی غلطی کی پاداش میں زمین پر وارد ہوئے تو پہلا خیال ستر پوشی کا آیا اور کپڑے کی عدم دستیاب کی صورت میں پیڑ کے پتوں سے کام چلایا گیا۔ بس وہ دن اور آج کا دن ستر پوشی ہی بنیادی ضرورت ٹھہری اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انسان کی حیثیت اس کی جاہ و حشمت کا اندازہ کپڑے سے لگایا جانے لگا۔ ہر تقریب میں بہترین لباس میں ملبوس بندے ہی دیکھنے والوں کی نظروں میں قابل ستائش ہوتے ہیں عمدہ لباس کی ایک یہ بھی خوبی ہے کہ سارے کالے کارنامے دیکھنے والوں کی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں اصل شخصیت پر پردہ پڑ جاتا ہے۔

سیٹھ فخر الدین نے کامیابی کی منزلیں کس طرح طے کیں اور کیا سے کیا ہو گیا یہ اس کا دل ہی جانتا ہو گا۔ عرش سے فرش تک کا راستہ تو نہایت آسان ہے انسان اچانک لڑھکتا ہوا گرتا ہے تو بالآخر فرش پر ہی رکتا ہے اور بعض تو فرش سے بھی کہیں نیچے تحت الثریٰ میں جا پہنچتے ہیں، لیکن فرش سے عرش تک پہنچنے میں جو جدوجہد کرنی ہوتی ہے اس کا تصور بھی آسان نہیں ہے۔ کڑی محنت کی دھوپ میں آبلہ پائی ہی اس راہ کی ہمسفر بنتی ہے۔

سیٹھ فخر الدین کے ساتھ یہی سب ہوا۔ شہر کی کئی کوٹھیاں آج بھی اس بات کی گواہ ہیں

کہ ان کی بنیادوں میں فخرو اور اس کے باپ کا پسینہ ملا ہوا ہے۔ گو کہ نصیرا اور فخرو نام کو تو وقت کی دھول نے دبا دیا۔ ہزار گز کی کوٹھی میں رہنے والے فخرو اور نصیرا نہیں بلکہ فخر الدین اور نصیر الدین بن گئے۔

فخرو نے ترقی کی منزل پر پہلا قدم کس طرح رکھا۔ باپ کے ساتھ مزدوری چھوڑ کر کپڑے کی گٹھری اُٹھائے دروازے دروازے "کپڑا لیلو" کی صدا لگائی۔ ایک قدم اور آگے بڑھا کپڑوں کا گٹھرا ایک چھوٹی دوکان میں تبدیل ہوا۔ ترقی کی منزلیں کلاتھ اسٹور سے ہوتی ہوئی کپڑا مل پر آ کر رک گئیں۔ فخرو سیٹھ فخر الدین میں تبدیل ہو گئے۔ اوپر والا جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ اس نے فخرو اور نصیرا کو بھی دیا اور خوب دیا۔

پہلے آج جیسے بے تحاشہ آبادی نہیں تھی زمین سستی تھی غریبوں کے کچے گھر بھی رقبہ میں بڑے ہوتے تھے۔ بڑے بڑے صحن میں ایستادہ آم، نیم اور جامن کے درخت اپنے سایہ سے مالکوں کو تازگی بخشتے تھے۔ وقت آگے بڑھا اور اپنے ساتھ بے تحاشا آبادی لایا زمین تنگ سے تنگ ہوتی چلی گئی مکان چھوٹے ہوتے کبوتروں کی کابک میں تبدیل ہو گئے۔ صحن سرے سے ندارد زندگی الیکٹرسٹی کی محتاج بن گئی۔ زمین مہنگی اور اس پر رہنے والا انسان سستا ہو گیا۔

نصیرا کا کچا دو کوٹھریوں کا مکان بھی چار سو گز میں تھا۔ مقدر نے اپنی چمک دکھائی اردگرد کی زمین خریدی گئی۔ مستری مزدور آ گئے۔ ان میں کچھ مزدور ایسے بھی تھے جو کبھی نصیرا کے ساتھ اینٹیں ڈھوتے تھے لیکن نصیرا کی آنکھیں ان کی شناخت کھو چکی تھیں۔

ویسے بھی باپ بیٹا ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ماضی دھول اور گرد میں ڈوبی ہوئی پسینہ میں نہائی ہوئی فاقوں کی ردا اوڑھے ہوئے۔

ماضی کی ایک زندہ یادگار فقیرا اور اس کی بیٹی شریفہ تھی۔ فقیرہ اس کا سگا بھائی اس کا ماں جایا جس کی بیٹی شریفہ کے ساتھ کبھی نصیرا نے بڑے چاؤ کے ساتھ بیٹے کی منگنی کی تھی۔ مگر اب فقیرہ سے خونی رشتہ اور بیٹے کی منگنی ماضی کی دھول میں چھپ گئے تھے۔ وہ جب فقیرہ اور اس کی بیٹی کو اپنی ہزار گز کی کوٹھی میں چلتا پھرتا دیکھتا تو اس کے چشم تصور میں چودھویں رات کا چمکتا دمکتا چاند طلوع ہوتا جس میں آب تاب کے ساتھ سیاہ داغ بھی نمایاں ہوں۔ فقیرہ اور اس کی بیٹی بھی چاند کے داغ کی طرح نظر آتی اسے فقیرا اپنا سب سے بڑا دشمن نظر آتا جو کھدر کا کرتا اور تہبند پہنے اس کا سر

جھکانے کو چلا آتا ہو۔

باپ بیٹا ہم خیال تھے لیکن نصیبن نے اپنا چولا نہیں بدلا تھا وہ آج بھی تنگ موری کے پائجامہ پر پیر کے انگوٹھوں میں چاندی کے چھلے پہنتی تھی۔ اس کے یہی انداز باپ بیٹے کو سخت ناپسند تھے۔ وہ اس کا چولا بدلنا چاہتے تھے لیکن وہ کسی طرح آمادہ نہیں تھی۔ وہ شریفہ کے ساتھ بیٹے کے رشتہ کو بھی بھولی نہیں تھی لیکن کل کا فقیرا اور آج کا نصیرالدین یہ کیسے گوارا کر لیتا کہ فقیرا اس کے کسی رشتہ دار کی بیٹی اس کی بہو بنے۔ وہ خاندان سقہ تھا اور ''سقہ'' ہمیشہ کے واسطے دفن کر کے اعلیٰ نسب اور اونچے گھر کی لڑکی لانا چاہتا تھا۔

دونوں باپ بیٹوں کی نظریں آسمان کی رفعتوں میں پرواز کر رہی تھیں سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ فخر الدین دولت کی قطب مینار پر ضرور بیٹھ گیا تھا لیکن شہر کے اکثر لوگ جانتے تھے کہ وہ ایک سقہ کی کولاد ہے۔ آج کے اس دور میں بھی جبکہ چند لوگوں کا دین و ایمان دولت ہے ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو شادی بیاہ میں سب سے پہلے حسب نسب دیکھتے ہیں باقی چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ پھر سیٹھ فخر الدین کی شادی ہو تو کیسے؟

عموماً نیچے سے اوپر کی طرف پرواز کرنے والے اپنی مکمل طاقت ملمع سازی پر صرف کر دیتے ہیں جبکہ خاندان اور پشتینی رئیس عرش سے فرش تک کے سفر کے بعد بھی وہی خو بو دہی رکھ رکھاؤ قائم رکھتے ہیں جو کبھی اُن کا طرۂ امتیاز تھا۔ یا پھر یہ سب ان کی فطرت میں رچ بس جاتا ہے۔ نصیر الدین کو بیٹے کی شادی کا بڑا ارمان تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا ہر ماں باپ بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کے خواب اس کے بچپن سے دیکھنے شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن اپنی سوچ کا کیا کرتا بہو کے معاملے میں اس کے خواب بہت اونچے تھے۔

کہتے ہیں ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے یہاں تو معاملہ صرف بہو کا تھا وفادار اور نمک خوار مینیجر کی مدد سے اس کا حل بھی نکل آیا لڑکی خیر سے لکھی پڑھی تھی۔ نمک خوار بے ایمان مینیجر نے بتایا وہاں سے کچھ لوگ گھر بار اور لڑکے کو دیکھنے آئیں گے، کسی دوسرے شہر میں خاندانی اعلیٰ گھر میں رشتے کی بات چل نکلی۔ مجھ سے حسب نسب اور سیٹھ جی کی تعلیم معلوم کر رہے تھے۔

مینیجر چلتا بنا اور باپ بیٹے کے واسطے سوچوں کے در وا کر گیا۔ دونوں سنجیدگی سے سوچ

رہے تھے۔ خاندان، تعلیم یہ دو الفاظ نہیں کوئی عفریت تھے جو ان کی خوشیوں کو نگلنے کو تیار تھے۔

''دیکھ فخر الدین تو سیٹھ ہے ہمارے پاس دولت کی کمی نہیں اور جہاں دولت ہو وہاں کوئی پریشانی زیادہ دیر ٹھہرتی نہ کوئی ایسا مسئلہ ہوتا ہے جس کا حل نہ ہو۔ بس تو کوئی ماشٹر (ٹیچر) لگا لے اور جلدی جلدی انگریزی (English) لی گٹ پٹ سیکھ لے بات بنی بنائی ہے'' نصیرا نے دیر تک سوچنے کے بعد مسئلہ کا حل پیش کیا۔

''لیکن ابا وہ!'' ....میں سب جانتا ہوں تو الف سے انار اور ب سے بکری کے قاعدے سے آگے نہیں پڑھا لیکن فکر مت کر کسی پڑھا کو کو خرید لے اور انگریجی (انگریزی) رٹ لے'' نصیرا نے بیٹے کی بات کاٹ کر تسلی دی۔ فخر الدین کے بھیجے میں باپ کا شاندار منصوبہ سما گیا۔

ویسے تو کسی سیٹھ کے واسطے تعلیم یافتہ ہونا قطعی غیر ضروری ہے۔ دولت اور تعلیم دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ آج کے ہندوستان میں سیکڑوں کیا بلکہ ہزاروں لاکھوں ڈگری یافتہ جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور بڑی سفارش سے کسی انگوٹھا چھاپ بزنس مین کے ڈرائیور ہو جاتے ہیں۔ جس ملک میں ہزاروں کی تعداد میں ڈاکٹر بیکار ہوں وہاں تعلیم ایک مذاق بن کر رہ جاتی ہے۔

اور پھر ''طوقِ زریں در گردنِ خری بنیم'' بھی برسوں پہلے شاید آج کے دور کے لئے کہا گیا تھا۔ اب کی بار مینیجر کو کسی قابل ترین ٹیوٹر کی تلاش پر مامور کر دیا گیا۔ دو روز کے اندر ٹیوٹر حاضر تھا۔

اس کو نہایت ادب و احترام کے ساتھ ڈرائنگ روم کے مہنگے صوفہ پر سجا دیا گیا۔ نصیر الدین اور فخر الدین سامنے والے صوفے پر تشریف فرما گئے۔ دونوں ہی سوچ رہے تھے بات کا آغاز کہاں سے کریں۔

دیکھو ''ماشٹر صاحب'' (ماسٹر صاحب) بات ایسی ہے کہ ہمارا بیٹا ویسے تو کسی سے کم نہیں بس ذرا لکھائی پڑھائی میں یوں ہی سا ہے۔'' نصیر الدین نے خاموشی کو الفاظ دیے۔

''کہاں ہے آپ کا بیٹا بلایئے؟'' ٹیوٹر نبیل احمد نے چاروں طرف دیکھ کر سوال کیا۔

''ارے میاں یہ تمہارے سامنے ہی تو بیٹھا ہے۔'' نصیرا کو ٹیوٹر کی بینائی کی فکر نے گھیر لیا۔ ''اچھا اچھا سیٹھ صاحب پڑھیں گے میں سمجھا کسی بچے کی ٹیوشن لینا ہے۔'' نبیل احمد کا لہجہ استعجابیہ تھا۔ یکی

سمجھ کر آیا تھا کسی اسکولی اسٹوڈینٹ کو پڑھانا ہے یہاں آ کر معلوم ہوا میاں فخر الدین پڑھنے کے لئے تلے بیٹھتے ہیں۔

''سنئے میں صرف ان اسٹوڈنٹس کو پڑھاتا ہوں جو با قاعدہ اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔'' نبیل احمد نے اکتائے ہوئے لہجہ میں کہا۔ ''بھیا یہ اسٹوڈینٹ کیا ہوتا ہے'' نصیرا نے شاید ایک لفظ سنا تھا۔ پڑھنے والے اسکولوں اور کالجوں میں با قاعدہ تعلیم حاصل کرنے والے نبیل احمد نے وضاحت کی۔

''فخر الدین دیر سے صوفے پر پہلو بدل رہا تھا یکا یک اس کے اندر بیٹھا سیٹھ بول پڑا، اپنی قیمت بتاؤ'' میری قیمت میں سمجھا نہیں۔'' نبیل احمد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

''ارے یار حیران کیوں ہوتے ہو وہ کیا ہوتا ہے؟ ایک اسٹوپڈ کے پڑھانے کا کیا لیتے ہو؟'' سیٹھ صاحب نے گل افشانی کی۔ ''اسٹوپڈ نہیں اسٹوڈینٹ۔ نبیل احمد نے تصیح کی۔
''ارے بھائی ہوگا کچھ مگر تم ان کو پڑھانے کا لیتے کیا ہو؟'' اسٹیپ بائی اسٹیپ کہتے کہتے نبیل احمد کو خیال آیا کہ وہ کن لوگوں سے مخاطب ہے لہٰذا اس نے سمجھانے کا انداز اختیار کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''فیس مقرر مقرر نہیں ہوتی کلاس اور مضامین کے حساب سے کمی بیشی ہوتی ہے۔''

''پھر بھی کچھ بتاؤ تو یار بے تکلفی سے بیٹھو اپنا ہی گھر سمجھو'' فخر الدین نے دوستانہ رویہ اپنایا۔ وہ کچھ تھا یا نہیں ایک کامیاب بزنس مین ضرور تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر یہ ماسٹر کا بچہ ہاتھ سے نکل گیا تو وہ بڑے خسارے سے دو چار ہو جائے گا۔ اسی دوران ایک ملازم لوازمات سے پُر ٹرالی لے کر اندر داخل ہوا۔

''یار ہم تو یاروں کے یار ہیں بے تکلفی سے کھاؤ اور بتاؤ ایک شاگرد سے کیا لیتے ہو؟'' فخر الدین نے نبیل احمد کا شانہ تھپتھپایا۔

ادھر نبیل احمد سوچ رہا تھا کن جاہلوں میں آ پھنسا ہے وہ بیچارہ تو اخبار میں اشتہار دیکھ کر آیا تھا۔ ''تین سو سے پانچ سو تک۔'' سوچ سے باہر آ کر نبیل احمد نے کہا۔ ''ہم تمہیں پانچ ہزار دیں گے'' فخر الدین نے حاتم کی قبر پر لات مارتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' نبیل احمد کا چونکنا فطری تھا وہ مڈل کلاس کا ذہن و ہونہار نو جوان تھا خود بھی

انگلش لٹریچر سے ایم۔اے فائنل کا اسٹوڈینٹ تھا تعلیم کا بوجھ اپنے ہی کاندھوں پر اٹھانے کو ٹیوشن کرتا تھا۔ایک اسٹوڈینٹ سے پانچ سو لینے والے کے واسطے پانچ ہزار آفر اس کی سوچ سے کہیں زیادہ تھی۔

''دیکھو ماشٹر صاحب بات اصل میں یہ ہے کہ چار مہینہ کے بعد اس کی شادی ہے بہو خیر سے سولہ کلاس پڑھی ہے بس تم اس کو اتنی انگریجی سکھا دو کہ یہ گٹ پٹ کرنے لگے۔ بہو یہی سمجھے کہ بہت پڑھا لکھا ہے''نصیرا اصل موضوع کی طرف آیا۔

پُرکشش فیس کے علاوہ ایک جاہل سیٹھ کو انگریزی کے الفاظ جملے رٹانے کا سودا نبیل احمد کو منافع کے علاوہ دلچسپ بھی لگا سو اس نے ہامی بھر لی۔''ٹھیک ہے کل سے پانچ بجے آجانا فخرالدین نے کہا۔''پانچ تو نہیں البتہ سات بجے تک آجاؤں گا۔''

''پرواہ نہیں جب دل چاہے آؤ تمہارا اپنا گھر ہے''فخرالدین باغ باغ تھے۔''وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ بھی مصروف ہوتے ہوں گے۔''نبیل احمد نے پوچھا۔''نہیں یار کوئی مصروف وصروف نہیں وہ الو کا پٹھا مینجر جو ہے سیٹھ جی نے مینجر کی شان میں شاندار اضافہ فرمایا۔وقت گزرتا گیا نبیل احمد نے انگریزی کے خاص خاص الفاظ فخرالدین کو رٹانا شروع کر دیئے پڑھائی کے دوران نصیرا بھی قریب ہی موجود رہتا۔اصل مسئلہ پڑھی لکھی کے آنے کا تھا اس لئے الفاظ بھی اسی مناسبت سے سکھائے گئے۔وائف،ہسبینڈ،مدر ان لاء،برادران لا،میرج سیری منی اور اسی قبیل کے بہت سے الفاظ فخرالدین نے اچھی طرح رٹ لئے۔

''یار یہ ابا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے میں تم سے کچھ خاص الفاظ سیکھنا چاہتا ہوں''فخرالدین نے ایک روز رازدارانہ لہجہ میں کہا''ذرا میرے کمرے میں آؤ۔''کمرے میں پہنچ کر فخرالدین نے چاروں طرف دیکھا پھر دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔''میں چاہتا ہوں کچھ پیار محبت سے الفاظ بھی سیکھوں جب آنے والی سے کہوں گا تو وہ ضرور مجھے قابل سمجھے گی۔''

''ارے اس کا تو مجھے دھیان ہی نہیں رہا۔''نبیل نے ایک بے ساختہ قہقہہ کا گلا گھونٹتے ہوئے کہا۔I Love you ڈارلنگ،مائی سوئٹ اور چند الفاظ جن کا لکھنا خلاف تہذیب ہے۔ فخرالدین کو رٹائے گئے۔

تعلیم کی فکر کو نبیل احمد نے آزاد کر دیا ابھی دو فکریں جان کو لگی تھیں۔ اور وہ تھیں حسب نسب، اور رکھ رکھاؤ۔ بے اندازہ دولت سے اس کا سدِ باب بھی کرنا تھا۔ شادی قریب قریب طے تھی جوں جوں دن قریب آتے جاتے نصیرالدین کی بدحواسی بڑھتی جا رہی تھی۔ سن رکھا تھا بڑے رکھ رکھاؤ والے لوگ ہیں۔

نصیرالدین نے سوچا فخرالدین تو خیر ٹھیک ٹھاک کپڑے پہنتا ہے رہا سوال میرا اور نصیبن کا۔ شجاعت علی خاں کی کوٹھی میں مہینوں اینٹیں ڈھوئی وہ ہمیشہ شیروانی اور رامپوری کیپ میں کتنے باوقار لگتے تھے۔ کسی میں نظر اٹھا کر بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اب اندازہ ہوا یہ ساری کرامت شیروانی اور ٹوپی کی تھی۔ مجھے بھی شیروانیاں سلوالینا چاہیے۔ جب شیروانی پہن کر رامپوری کیپ اوڑھ کر بہو کے سامنے جاؤں گا تو وہ خود بخود واجت (عزت) کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس طرف سے اطمینان ہوا تو ذہنی رو نے پھر نصیبن کی طرف سفر کیا۔

اس نصیبن کا کیا کروں۔ جو پنڈلیوں پر غلاف چڑھائے انگوٹھوں میں چاندی کے چھلے پہنے بیٹھی رہتی ہے۔ ہائے ہائے بازار میں کیسی کیسی عورتیں سوٹ اور ساڑھیاں پہنے نظروں کے آگے سے گزرتی ہیں اور ایک یہ نصیبن ہے اللہ نے اتنا کچھ دیا ہے پر مجال ہے جو ڈھنگ کے کپڑے پہن لے۔ شیروانی والے خان صاحب (خانصاحب) کی بیگم گرارہ (غرارہ) پہنتی تھیں کیا ٹھسے کی بیگم لگتی تھیں۔ خیر اب اس کی ایک نہیں چلنے دوں گا۔ اس کمبخت کے لئے اعلیٰ درجہ کے سوٹ اور غرارے سلوادوں گا۔ جب سل جائیں گے تو پہن ہی لے گی۔

نصیرا نے سلے ہوئے اعلیٰ درجہ کے سوٹ اور غرارے نصیبن کے آگے ڈھیر کر دیئے۔

''دیکھ اللہ کی بندی میرا کہا مان تو اس بڑھاپے میں بھی کسی سے کم نہیں ہے اور جوانی میں تو میں تیری صورت کا دیوانہ تھا۔ جات (ذات) برادری میں تو سب سے کھو بصورت (خوبصورت) لڑکی ہوا کرتی تھی۔''

نصیرالدین لاکھ جاہل سہی لیکن اسے اس نفسیاتی گر کا اندازہ تھا کہ عورت خواہ کسی عمر کی ہو شکل صورت کی تعریف سن کر ہواؤں میں اڑنے لگتی ہے۔ اور یہ تعریف اگر مجازی خدا کی زبان سے ہو تو اس کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ نصیبن پھول کر کپا ہو گئی۔ ''اب تو اتنی محبت سے لے ہی

آئے ہو تو پہن ہی لوں گی۔ پر گرارہ پہن کر چلوں گی کیسے میں تو اس میں لپٹ کر کہیں کی کہیں جا پڑوں گی۔'' نصیبن کی خوشی دیدنی تھی۔

''تو چل ہی مت بس بیٹھی رہ کھانصاحب کی بیگم کی طرح اور یہ تو انگوٹھوں سے چھلے بھی نکال دے۔'' نصیبن کو پٹری پر آتے دیکھ کر نصیرا نے مشورہ سے نوازا۔

نہ فخرو کے ابا ایسا نہ بول میں یہ بات نہ ماننے کی یہ چھلے سگون (شگون) کے ہیں سادی (شادی) پر پہنے تھے جب تک تو جندہ (زندہ) ہے میں چھلے نہ اتارنے کی'' نصیبن ہاتھ نچا کر بولی

''اچھا چل جیسی تیری مرجی (مرضی) پر ایک بات اور سن تو بہو کے سامنے جیادہ بڑبڑ بولنا بھی مت۔'' نصیرا نے سرگوشی کی۔'' کیوں کیا وہ میری ساس ہوگی بہو تو بہو ہی ہے'' نصیبن ابرو چڑھا کر بولی۔

''بس تیرے اندر یہی ایک خرابی ہے بات کو سمجھتی نہیں ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے تو نے زیادہ پٹر پٹر کی تو وہ کہیں یہ نہ جان لے کہ ہماری جات برادری کیا ہے؟'' نصیرا نے اپنی منطق جھاڑی۔ اللہ کے بندے کبھی عقل کی بھی بات کرلیا کر۔ تجھے تو جات برادری کی بیماری لگ گئی ہے۔ ارے اللہ نے جس جات میں چاہا پیدا کردیا۔ نصیبن نے جھاڑ چھپاڑ کی۔

''ارے تو تو اعلیٰ خاندان کی لونڈیا کے سامنے ہماری عجت (عزت) کا جنازہ نکالنے پر تلی ہوئی ہے'' نصیرا غصہ میں لال پیلا ہوا۔''تو کیوں لا رہا ہے اچھے خاندان کی لونڈیا یہ کریو، یہ مت کریو، ایسے بولیو۔ اپنی شریفہ میں کیا برائی نظر آ گئی بچپن کی مانگ مجھ سے محبت کرے ہے میرے دس کام کرتی ہے۔ سو الگ'' نصیبن نصیرا کے غصہ کو ذرا خاطر میں نہ لائی۔

''کیوں کراتی ہے اس سے دس کام وہ کمبخت یہاں آتی ہی کیوں ہے۔ کام کاج کے لئے درجن بھر نوکر چاکر کیا مر گئے ہیں۔ وہ تو چاہتی ہے شریفہ کو بیاہ کر پھر سے وہی بنا رہا ہوں جو ہوں'' نصیرا کا غصہ عروج پر تھا۔''ارے تو کیا بہو کے آجانے سے تیرا باپ بدل جائے گا تو تو جو ہے وہی رہے گا نا۔'' نصیبن اپنی بات پر اڑی رہی۔

''چپ کمبخت تیرے دماغ میں تو بھوسا بھرا ہے۔ ارے میں سیٹھ فخر الدین کا باپ ہوں باپ سمجھی۔'' نصیرا بالکل ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔

''ارے کیا سیٹھ سیٹھ لگا رکھا ہے کیا سیٹھ بھی کوئی جات (ذات) ہوتی ہے۔ کیا سیٹھ پیڑوں پت اُگتے ہیں۔ نصیبن کہاں ہار ماننے والی تھی۔

اس بحث میں نصیرا کے ساتھ فخرالدین بھی شامل تھا ماں کی بات اس کے دل کو لگی۔ ''ابا ماں کہتی تو ٹھیک ہے ہمیں اپنے نام کے آگے کسی اچھی ذات کا ٹھپہ ضرور لگانا چاہیے کل کلاں کو لڑکی والوں کو معلوم کرلیا تو کیا جواب دیں گے۔ فخرالدین بہت دور کی کوڑی لایا۔

نصیرا جاہل ضرور تھا لیکن آدھی صدی سے زیادہ وہ دنیا دیکھ چکا تھا جھٹ بول پڑا کیوں نہ ہم سید کہلانا شروع کردیں۔

''اللہ اللہ کر فخرو کے ابا چار دن کی دولت نے تجھے پاگل ہی نہیں اندھا بنا دیا ہے۔ سید آلِ رسول ہوتے ہیں ہم سب پر ان کا ادب لازم ہے۔ تو دولت کے بل بوتے پر رسول کی اولاد میں شامل ہونا چاہتا ہے ارے ہمارے لئے یہی بہت ہے کہ ہم حضور کے امتی ہیں۔ قیامت کے دن شفاعت تو نصیب ہو جائے گی۔ جلدی سے توبہ کرلے کہیں کوئی اجاب (عذاب) نہ آجائے'' نصیبن کلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ باپ بیٹے نے سر جھکا لیا شاید دونوں ہی نصیبن سے متفق ہو گئے تھے۔

نصیرا کا دماغ کچھ زیادہ ہی زرخیز واقع ہوا ہے''۔ کھانصاحب (خان صاحب) کیسا رہے گا'' سر اٹھا کر گل فشانی کی۔ فخرالدین نے ستائش نظروں سے باپ کو دیکھ کر ہاں میں ہاں تھا۔

''پر بات یہ ہے کہ........

تو چپکی بیٹھ اب کہے گی حویلی والے خاں صاحب ڈنڈا لے کر مارنے کو نہ آجاویں۔ فخرالدین نے نصیبن کی بات کاٹی۔ ''نہیں فخرو کے ابا میں سوچ رہی ہوں جب تو کھانصاحب کہلائے گا تو تیری ماں پر گالی نہیں پڑے گی؟ نصیبن نے ایک اور مسئلہ اٹھایا۔ چھوڑ اس بات کو آج نہ جانے کتنے خان صاحب بن بیٹھے۔

شادی سے چند روز قبل نصیرالدین بہو کے چڑھاوے کے بیش قیمت زیوارت کے ڈیزائن دکھانے کے بہانے سمدھیانے جا پہنچے۔

'' آیئے خان صاحب کہہ کر جب سمدھیانے والوں نے استقبال کیا تو بیہوش ہوتے

ہوتے بچے۔ چڑھاوے کے زیورات لاکھوں کی مالیت کے تھے پھر کیسے نے وہ لوگ مرعوب ہوتے۔ زبردست خاطر مدارات ہوئی۔ اپنی ہزار گز کی کوٹھی میں داخل ہوتے ہوئے نصیرا کے پیر زمین پر نہیں پڑ رہے تھے مانو ماؤنٹ ایوریسٹ فتح کر کے لوٹا ہو۔ ''ارے نصیبن فخر الدین کہاں ہو؟ اے ایسی آؤ بھگت دیکھی نہ سنی بار بار مجھے خان صاحب کہہ کر بات کر رہے تھے۔'' نصیرالدین نے فرضی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

''فخرو کے ابا تم ایسے خوش ہو جیسے لاٹری نکل آئی ہو۔'' نصیبن نے تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑ کر آتے ہوئے کہا۔ لاٹری ہی نکل آئی ہے۔ دولت کی نہیں حسب نسب کی۔ نصیرا کی خوشی دیدنی تھی۔

''تو یہ ہے تو اس میں اتنا خوش ہونے والی کیا بات ہے ان کے کہنے سے تو کھان صاحب تھوڑی ہو گیا۔'' نصیبن حسب عادت جھلائی۔

''کمبخت ساری خوشیوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔ نصیرا منہ میں بد بدایا۔ شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں اور کیوں نہ ہوتیں دولت اپنی آب وتاب دکھارہی تھی کہ اچانک مینجر ہانپتا کانپتا آیا۔

''ارے بھائی بیٹھو گھبرائے ہوئے کیوں ہو کیا پاگل کتا پیچھے پڑ گیا'' فخر الدین آج کل کچھ زیادہ ہی بااخلاق ومہمان نواز نظر آرہا تھا ورنہ عام حالات میں تو کسی سے سیدھے منہ بات کرنا خلاف شان سمجھتا تھا۔ ''سیٹھ جی غضب ہو گیا'' مینجر کی آواز نکلی۔

''کہیں لڑکی والوں نے بڑی مانگ تو نہیں رکھ دی۔ مل یا کوٹھی تو بیٹی کے نام نہیں لکھوانا چاہتے ہیں'' نصیرا نے سوچ کو الفاظ دیئے۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے وہ لوگ آپ سے بہت شرمندہ ہیں'' مینجر نے تمہید باندھی۔ ''ایسی کیا بات ہو گئی جو کہنا ہے صاف کہو فخر الدین کا ماتھا ٹھنکا۔

''لڑکی اس شادی پر راضی نہیں ہے'' مینجر نے اس طرح چبا چبا کر کہا گویا اس فعل میں سو فیصدی اس کا ہاتھ ہو۔ ''راضی نہیں ہے تو رشتہ کا ہے کو کیا تھا خاندانی لوگ کہیں زبان دے کر مکرتے ہیں کھل کر بتاؤ کیا بات ہے؟'' نصیرا بولا۔

''بات ایسی ہے لڑکی کا اپنے چچا کے بیٹے سے چکر چل رہا تھا گھر والے راضی نہیں

تھے۔ میں نے سیٹھ جی کی تعریفیں کیں انہوں نے جھٹ ہامی بھر لی'' منیجر نے تفصیل میں جاتے ہوئے کہا۔ پھر اب انکاری کیوں ہو گئے۔ نصیرا نے سبب جاننا چاہا۔ اب لڑکی نے جو کچھ بتایا اس کی روشنی میں چچازاد کے علاوہ کسی اور سے شادی ہو ہی نہیں سکتی۔

اوہ تو لونڈیا نے یہ گل کھلایا اور وے خاندانی لوگ اسے ہمارے سر منڈنا چاہتے تھے تو نے تو ان کی شرافت کے بڑے گن گائے تھے۔

نصیرا کا سارا نزلہ بیچارے منیجر پر ٹوٹا۔ صاحب اندرونی حالات مجھے کیسے معلوم ہوتے'' منیجر اپنی صفائی میں بولا۔

''ارے بدھو جب لونڈیا عشق کی پینگیں لڑا رہی تھی تو پہلے ہی سالے چچازاد سے کیوں نہ کردی یہاں ہاں کرنے کی ضرورت کیا تھی؟'' نصیرا نے ضابطہ کی بات کی۔

''صاحب یہ راز بھی اب اڑنے جا کے کھلا۔ اچھا ہوا آپ لوگ بچ گئے۔ وہ لوگ خاندانی نہیں تھے۔ نام سے پہلے مرزا اور آگے بیگ لگا کر مغل بن بیٹھے تھے۔ خاندان سے ہٹ کر اعلیٰ خاندان میں لڑکی دینا چاہتے تھے۔ میں نے بتایا تھا کہ سیٹھ جی خاندانی اور اعلیٰ حسب نسب کے ہیں تو لبچھ گئے۔ پر لڑکی نے نہ مانا صاف کہہ دیا مجھے حسب نسب نہیں چچازاد چاہیے۔''

''خیر آپ بے فکر رہیں اپنے سیٹھ جی کے لئے لڑکیوں کی کیا کمی۔ ایک اشارے کی دیر ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان کے لڑکیوں کی ''کیو'' لگ جائے گی۔ منیجر تسلی دلاسہ دے کر چلتا بنا اور باپ بیٹوں کے واسطے سوچوں کے در وا کرتا گیا۔

دونوں نے بڑی دیر مراقبہ میں رہنے کے بعد سر اٹھا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ شاید وہ اس حقیقت کو پانے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ انسان صرف انسان ہوتا ہے ذات پات اونچ نیچ سے ماورا، روز حشر قبروں سے اٹھ کر کھڑے ہونے والے اور میدان حشر میں جمع ہونے والے صرف اور صرف اچھے یا برے اعمال کے جوابدہ ہونگے اس دنیاوی زندگی میں انسان کی خوبی بڑائی صرف کردار سے ہوتی ہے اعلیٰ حسب نسب سے نہیں۔

نصیرا گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور بچپن کی مانگ کی یاد دہانی کرانے فقیرہ کے بوسیدہ گھر کی طرف چل دیا۔ ☆☆☆

مریم خان (پوتی)